دو ہاتھ

افسانے

عصمت چغتائی

شیش محل کتاب گھر

۱۵۔ سرکلر روڈ ــــــ لاہور

انتساب

پڑھنے والوں کے نام

عصمت چغتائی

ترتیب

کرشن چندر

میرا ہمدم میرا دوست

پہلے تو سوچا عنوان بدل دوں، عصمت کے لئے "میرا ہمدم میرا دوست" کہنا کسی طرح سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ پھر سوچا اگر "میری ہمدم میری دوست" کہوں گا تو میری بیوی اور عصمت کا شوہر دونوں مجھ پر مقدمہ کر دیں گے۔ لہٰذا یہی قرار پایا کہ عنوان نہ بدلا جائے۔ عجب مصیبت ہے۔ ٹائٹل مردانہ ہے اور ذکر زنانہ!

گندمی رنگ کی دوہرے بدن کی اونچی پوری عورت۔ اچھے خاصے مرد کو دو ہاتھ مار دے تو وہیں چیں بول جائے۔ شکل و صورت سے بڑی بھولی اور معصوم معلوم ہوتی ہے لیکن ہے نہایت کھٹکتی اور شریر، زہر میں بجھی ہوئی طبیعت پائی ہے۔ نہایت معصوم بن کر محفل میں

تک سکے سے درست ہو کر جب سنجیدہ رو ہو کر بیٹھتی ہے۔ تو اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جانے اب اس کے منہ سے کیسے پھول جھڑیں گے۔ لیکن جب پھول جھڑنا شروع ہو جاتے ہیں تو جھڑتے ہی چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ سننے والے کے چہرے پر پت جھڑ کا موسم چھا جاتا ہے صورت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے اس وقت بیچارے کی! ہزار داؤ پیچ سے اپنی خفت مٹانے کی کوشش کرتا ہے مگر عصمت کوئی وار خالی جانے نہیں دیتی اور جب تک اچھی طرح زچ نہ کرلے۔ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ عصمت سے گفتگو کرنا نہایت آسان ہے لیکن ایک بار گفتگو شروع کر کے اسے ختم کرنا محال ہے۔ اکثر اوقات تو ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی ہے۔ مگر پھر عصمت کے قد و قامت کو دیکھ کر یار لوگوں نے چپ ہو کر ہار ماننے ہی میں خیریت سمجھی ہے۔ گفتگو کا موضوع کچھ بھی ہو، اس سے عصمت کو کوئی سروکار نہیں۔ اس کا اصل مقصد دوسرے کو جلانا اور نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ فریق مخالف بھڑک کر غصے سے پھٹ پڑے۔ اس وقت عصمت کے چہرے کی خوشی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑا معرکہ سر کر لیا۔ پھر وہ ایکدم بدل جاتی ہے اور ہارے ہوئے فریق کو رمی کھیلنے کی دعوت دیتی ہے چائے پینے کے لئے اصرار کرتی ہے اور انتہائی شیریں لہجے میں زیر بحث موضوع سے ہٹ کر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتی ہے۔ عصمت کو ہارے ہوئے لوگوں سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے لیکن اپنی

بات والے، ہیکڑی جتانے والے لوگوں سے ہمیشہ خار کھاتی ہے اور جب تک وہ انہیں نیچا نہیں دکھاتی اسے چین نہیں آتا۔ اس معاملے میں وہ کج بحثی کی حد تک جا سکتی ہے اور اکثر اوقات چلی جاتی ہے۔ اگر آپ کسی شخص یا مسئلے کے بارے میں اسکے خلاف بولیں گے تو وہ حق میں بولے گی۔ آپ حق میں بولیں گے تو وہ خلاف بولے گی۔ خود ہی ایک بات کہے گی اور اگر آپ نے بحث سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ خود ہی اپنی رائے کی تردید پر تردید کرتی چلی جائے گی اور آپ کو گفتگو میں اس قدر الجھائے گی کہ آپ بالکل احمق اور بے وقوف نظر آنے لگیں گے۔ ایسی خبیث عورت ہے عصمت! بالکل بلّی ہے بلّی! زیر بحث موضوع کو اپنے پنجوں میں داب کر ایک چوہے کی طرح نچاتی ہے۔ کبھی چمگادڑ بن کر ایک محفل میں دو فریقوں کو لڑواتی چلی جائے گی۔ کبھی ایک کے حق میں بات کہے گی کبھی دوسرے کے حق میں۔ کبھی ایک فریق کو شہ دے گی کبھی دوسرے کو۔ اور پھر منہ در منہ ان دونوں کے سامنے ایکدوسرے کی باتوں کو اس طرح توڑ موڑ کر پیش کرے گی کہ دونوں فریق لڑنے مرنے پہ تیار ہو جائیں گے اور جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی تو خود ہی پلٹ جائے گی اور بے حد معصوم بن کر اور گھبرا کر کہے گی: "دیکھو بھئی اگر لڑنا ہے تو باہر جا کر لڑو، میرے گھر میں مت لڑو۔ مجھے لڑائی سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔"

مگر اسے اس بات کا بڑا ارمان ہے کہ "آج تک کرشن   بہری بھی

لڑائی نہیں ہوئی ہے - اول نمبر کا حرامی ہے - ہمیشہ کنی کاٹ جاتا ہے کبھی بحث میں نہیں اُلجھتا - اور یہ بالکل سچ ہے - میں عصمت سے کبھی بحث نہیں کرتا یا تو صاف طرح دے جاؤں گا - یا "مجھے معلوم نہیں" کہہ کر پیچھا چھڑا لوں گا - ایک بار ذراسی جھک ہوئی تھی ہوا یہ کہ ہم دونوں کا ایک عزیز دوست اس دنیا سے چل بسا - ہم دونوں نہایت ہی قاعدے سے افسردہ اور رنجور لہجے میں اپنے دوست کی موت پر تبصرہ کر رہے تھے - اتنے میں میرے منہ سے نکل گیا "ہے ہے بیچارے کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو گئے"۔ عصمت فوراً بول پڑیں - "لو بھئی یتیم ہونے میں کیا بُرائی ہے - یتیم ہونے میں تو سچ مچ بڑے مزے ہیں - ایک بار ہمارے رشتے کی ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہو گیا - اس کی بیوی اپنے چاروں بچوں کو لے کر ہمارے گھر میں آ گئی - کیا بتاؤں، کیسے کیسے مزے مرحوم کے یتیم بچوں نے کئے ہیں - اسکول کھلنے کا زمانہ ہوتا - تو سب سے پہلے ان یتیم بچوں کے داخلے کی فیس اور کتابوں کا انتظام کیا جاتا تھا - عید آتی تھی تو سب سے پہلے اُنکے کپڑے بنتے تھے گھر میں کوئی دعوت ہوتی تھی تو سب سے پہلے انہی کو کھانا کھلایا جاتا - یہ کہہ کر کہ بے چارے یتیم ہیں - سچ کہتی ہوں کرشن، ان بچوں کو دیکھ کر میں نے اللہ میاں سے کئی بار کہا ـــــ "یا اللہ! مجھے بھی یتیم کر دے"۔

اس دن طرح طرح کی دلچسپ مثالیں دے کر عصمت نے یتیم ہونے کے فائدے کچھ اس طرح سے بیان کئے - کہ میرا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ کر

یتیم خانے میں بھرتی ہو جاؤں۔

گفتگو کا یہ اعجاز عصمت کو ورثے میں ملا ہے۔ دراصل عصمت کے مزاج کو اس وقت تک صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک کہ اس کے خاندان کی دو اور عورتوں کو دیکھا یا سنا نہ جائے۔ میرا اشارہ جمیلہ اور اختر آپا سے ہے۔ قد و قامت اور شکل و صورت ہی میں نہیں بلکہ مزاج کے افتاد کے اعتبار سے بھی، یہ تینوں عورتیں عصمت، جمیلہ اور اختر آپا ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ جس محفل میں یہ تینوں بیٹھ جائیں اسے کشتِ زعفران بنا دیتی ہیں۔ گفتگو کی دلچسپی کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ گھنٹوں سنیں تو بور نہ ہوں۔ سیاست دانوں کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑے باتونی اور جھکی ہوتے ہیں اور ہر وقت اپنی سی کہے جاتے ہیں۔ لیکن ان تینوں کے سامنے میں نے اور دوسرے لوگوں نے اکثر بڑے بڑے سیاست دانوں کو جن کی سیاست اور گفت گو کی ساری دنیا میں دھوم ہے زانوئے ادب تہہ کر کے ان تینوں کی گفتگو میں نہایت ذوق و شوق سے حصہ لیتے دیکھا ہے۔ اکثر اوقات میرا جی چاہا ہے کہ عصمت کی گفتگو ٹیپ پر ریکارڈ کر لی جائے۔ تاکہ دنیا کی دوسری عورتیں بھی جلانے اور تپانے کے لئے نئے نئے گر سیکھ لیں۔ مگر عصمت کو ٹیپ یا مائیک سے بڑی گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ کسی ذہین سے ذہین آدمی سے اس قدر نہیں گھبراتی ہیں جتنا ایک مائک سے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ قریب ہی کہیں ٹیپ یا مائیک ہے تو بالکل ٹھس ہو کر بیٹھ جائے گی،

اور ایک دلچسپ فقرہ بھی نہ بولے گی۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ عصمت ہر وقت باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس پر کبھی کبھی غناٹے کے لمبے لمبے دورے پڑتے ہیں۔ جن میں وہ تقریباً غبن سی ہو جاتی ہے۔ بال الجھے الجھے سے، آنکھیں سوئی سوئی سی ساڑھی ملگجی سی۔ بات کرو تو صرف ہوں ہاں میں جواب ملتا ہے۔ صبح آؤ تو معلوم ہوتا ہے سو رہی ہیں۔ دوپہر میں آؤ تو معلوم ہوتا ہے سو رہی ہیں۔ سہ پہر میں آؤ تو معلوم ہوتا ہے کھانا کھا کے سو گئی ہیں۔ شام کو آؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ چائے پی کر اونگھ رہی ہیں یا خاموشی سے گھنٹوں رمی کھیلے جا رہی ہیں۔ ہزار کوشش کرو بات نہیں کرے گی۔ اس طرح غبی بنکر آپ کی صورت کو تکے گی۔ گویا آج آپ سے پہلی بار تعارف ہوا ہے۔

"ارے بھئی عصمت کوئی بات کرو۔"

"اول؟"

"سٹائن بک کا نیا ناول آیا ہے تم نے پڑھا ہے؟"

"کون سٹائن بک؟"

اس کے بعد دس پندرہ منٹ تک میرا خاموش رہنا ضروری ہے دس پندرہ منٹ کے بعد میں پھر کوشش کرتا ہوں۔

"مرارجی کا نیا بجٹ تم نے دیکھا ہے؟"

"کون مرارجی؟"

ایسے وقت میں میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا یا اس کا منہ نوچ لوں۔ مگر

طبیعت پر جبر کر کے صبر کر لیتا ہوں۔ آدھ گھنٹے تک خاموش رہتا ہوں۔ پھر کوشش کرتا ہوں۔

"کچھ سنا تم نے؟"

"اوں؟"

"پاکستان رائٹرز گلڈ نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا ہے۔"

بحث پاکستان اور ہندوستان کے مسئلے پر چل پڑے گی اور چنگاریاں اڑیں گی۔ عصمت کے کٹیلے جملے سننے کو ملیں گے اور عصمت بھی اب شائد گفتگو پر مائل معلوم ہوتی ہے وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ ایک انگلی اپنی کنپٹی کے بالوں میں ڈال کر گھماتی ہے اور سوچ سوچ کر کہتی ہے۔

"سر میں کھجلی ہو رہی ہے!"

میں سٹپٹا کر پتے پھینک دیتا ہوں مگر عصمت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ رمی چھوڑ کر PATIENCE کھیلنے لگتی ہے۔

دراصل خاموشی کے یہ لمبے لمبے دورے کسی خوفناک افسانے کی آمد کا پیش خیمہ ہوتے ہیں یا کسی ناول کی تیاری۔ ان دنوں نہ صرف عصمت، خاموش نظر آتی ہے بلکہ پورا گھر تلپٹ دکھائی دیتا ہے۔ ڈرائنگ روم منتشر شدہ حالت میں دکھائی دیتا ہے۔ ڈرائنگ ٹیبل پر بچوں کی کتابیں اور کاپیاں نظر آتی ہیں۔ باتھ روم میں میلے کپڑوں کے انبار نظر آتے ہیں بیڈ روم کی ہر چیز اپنی مالکن کے سگھڑاپے اور سلیقے کی شکوہ سنج نظر آتی ہے بستر پر رسالے اخبار، کنگھیاں، پوڈر پف بھل اور نئے خریدے ہوئے جوتے

نظر آتے ہیں۔ سرہانے پر ٹائم پیس الٹا پڑا ہے۔ پاندان میں سرخ مرچیں رکھی ہیں۔ سوئی دھاگے والی ٹوکری میں پان رکھے ہیں اور چھالیہ کی پڑیا کسی پرانے سلیپر کے اندر گھسی ہوئی ہے۔ یہ کیفیت دنوں کبھی ہفتوں کبھی مہینوں تک جاری رہتی ہے پھر ایک دن آیئے تو گھر آئینے کی طرح صاف ستھرا ملے گا۔ ڈرائنگ روم کی ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ڈائیننگ ٹیبل پر پھول سجے ہوئے اور میٹ لگے ہوئے۔ بیڈ روم کے پردے دھلے ہوئے اور ہر چیز آراستہ اور سلیقے سے عبارت معلوم ہوتا ہے۔ عصمت نے افسانہ یا ناول ختم کر لیا ہے اور اب خالی الذہن ہو کر گھر کی صفائی کی طرف توجہ دے رہی ہیں۔

آج سے ۲۳ سال پہلے میں نے اور شاہد لطیف نے عصمت کی شادی کر دی تھی۔ یہ بات شاید عصمت کو معلوم نہیں ہے ورنہ میرے لتے لے ڈالتیں۔ آج سے ۲۳ سال پہلے ۱۹۴۰ء کی ایک سلونی شام کا ذکر ہے میں اور شاہد لطیف جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے کباب کھا رہے تھے اور طے کر رہے تھے کہ شاہد لطیف ان دنوں بہت اچھے افسانے لکھا کرتے تھے اور کنوارے تھے۔ چٹپٹے کبابوں کی پلیٹ میں بہت سے نام آئے اور خاموشی سے نگل لئے گئے۔ جب عصمت کا نام آیا۔ تو شاہد لطیف خوشی سے اچھل پڑا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔" دوست! اگر میری شادی عصمت سے ہو جائے تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھوں گا۔

" اس میں کیا شبہ ہے"، میں نے جواب دیا۔

"مگر کوئی ترکیب بتاؤ ـــــ"

سوچ سوچ کر یہ ترکیب نکالی گئی کہ عصمت کو تقریر کرنے کے لئے ریڈیو اسٹیشن بلایا جائے (میں ان دنوں ریڈیو اسٹیشن دہلی میں ملازم تھا) میں نے موقعہ دیکھ کر عصمت کو ریڈیو پر تقریر کرنے کی دعوت دی مگر جب تک عصمت دہلی آئیں شاید دہلی سے بمبئی آ چکا تھا کیونکہ اسے بمبئی ٹاکیز میں مکالمہ نگار کی حیثیت سے ایک عمدہ اور بہتر نوکری مل گئی تھی۔ پھر میں دہلی سے لکھنؤ چلا گیا۔ پھر میں نے سنا۔ عصمت بمبئی چلی گئی ہے۔ پھر ایک دن عصمت کا خط میرے نام لکھنؤ آیا جس سے معلوم ہوا۔ کہ عصمت کی شادی شاہد لطیف سے ہو گئی ہے۔ پھر میں لکھنؤ سے پونا چلا گیا۔ وہاں دو برس رہ کر بمبئی گیا تو دونوں میری صورت سے بیزار نظر آتے تھے شادی کے پہلے دنوں کا رنگ روپ اڑ چکا تھا۔ اور دونوں اپنی اصلی حالت اور فطرت کو لوٹ رہے تھے شاہد لطیف پٹھانا بچہ۔ عصمت مغل۔ شاہد لطیف ایک کامیاب ڈائرکٹر۔ عصمت چوٹی کی افسانہ نگار۔ دونوں کا خون جوش مارتا تھا۔ کوئی کسی سے دبنے کو تیار نہیں وہ دھوم دھام سے میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی کہ دیکھنے والوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔

میرا ایک عقیدہ یہ ہے کہ میاں بیوی کی لڑائی میں جو دخل دیتا ہے اس سے بڑا احمق اور بے وقوف کوئی نہیں ہوتا۔ میرا دوسرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ ہزار لڑائی جھگڑے مناقشے کے باوجود عصمت اور شاہد ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ جھگڑا کسی بنیادی تضاد کو لے کر کھڑا نہیں ہوتا

بلکہ فروعی باتوں پر ہوتا ہے ۔ کوئی فلمی کہانی ۔ اسکرین پلے ۔ عصمت کے مکالمے شاہد کی ہدایت کاری ان باتوں کو لے کر آگے بڑھ جاتی ہے ۔ اور عصمت کو جلانے نپانے ۔ کلپانے کی عادت تو ہے ہی ۔ ایسے ایسے جملے چست کرتی ہے کہ شاہد جل کے خاک ہو جاتا ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہنگامی مزاج کے باوجود شاہد اور عصمت دونوں کے اندر ایک بنیادی لطافت موجود ہے ۔ دونوں دل سے ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں چاہے کتنے ہی سخت جملے ایک دوسرے پر کیوں نہ کسیں پھر دونوں بچیوں سے شدید الفت کرتے ہیں ۔ اکثر میں نے اس زہریلی ناگن کو دیکھا ہے کہ روائتی ماں بنی ہوئی ہے ۔ ایک کرسی کے کنارے بیٹھی ہے اور دوسری کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنی سولہ سالہ لڑکی سیما کے منہ میں لقمے ڈال رہی ہے اس وقت عصمت پر ایک عجیب محویت کا عالم ہوتا ہے ۔ جسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے ۔ اکثر لوگوں نے صرف عصمت کے تیزابی جملے سنے ہیں وہ اس شہد بھرے لہجے سے آگاہ نہیں ہیں ۔ جسے وہ شب و روز اپنے بچوں پر صرف کرتی ہے ۔

اب تو کوئی دھیان نہیں دیتا ۔ لیکن شروع شروع میں بمبئی کے ادبی اور فلمی حلقوں میں ان جھگڑوں کو بڑی سنجیدگی سے لیا جاتا تھا ۔ کسی نئے جھگڑے کے شروع ہوتے ہی یار لوگوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتیں ۔ دونوں فریقوں کو منانے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں ۔ ادھر عصمت اینٹھی جا رہی ہے اور شاہد پھیل رہے ہیں اور بیچ بچاؤ والے ہیں کہ کبھی عصمت کے ہاتھ

جوڑتے ہیں اور کبھی شاہد کے۔ میرا خیال ہے اس سارے ڈرامے میں عصمت کو سب سے زیادہ مزا آتا ہوگا۔

ایک روز سردار جعفری میرے پاس روتا ہوا آیا۔

"کرے شن!" وہ بولا "عصمت اور شاہد میں سخت جھگڑا ہو گیا ہے"

"چھوڑو بھی!" میں نے کہا

"نہیں کرے شن! یہ وہ والا جھگڑا ہے جو ایک دوسرے کو الگ کرا دیتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے" سردار بولا۔

"ہٹاؤ!"

"ارے مان جاؤ، بہت خوفناک جھگڑا ہے۔ شاہد لطیف نے نیشنل اسپورٹس کلب میں الگ رہنے کے لئے ایک کمرہ بک کر لیا ہے۔ میں نے خود منیجر سے بات کر کے اس کی تصدیق کر لی ہے۔

"تب تو بہت گمبھیر معاملہ ہے۔ میں نے سوچا۔ دوسرے دن جب میں عصمت کے گھر گیا تو دونوں میاں بیوی سفید براق کپڑوں میں ملبوس دو خوبصورت کبوتروں کی طرح ایک ہی صوفے پر ساتھ ساتھ لگے بیٹھے اور عصمت بڑی میٹھی آواز میں سیما سے کہہ رہی تھی — سیما دیکھنا! اگر خربوزے میٹھے ہوں تو کاٹ کر اپنے پاپا کے لئے رفریجڈیر میں رکھ دینا۔

"چڑیل! میں بڑبڑایا

صفائی اور بے باکی میں عصمت کا جواب نہیں ہے۔ اس کے بے باک

افسانوں اور مضامین کی بناء پر اس پر کئی مقدمے چل چکے ہیں۔ مگر بالآخر ہر مقدمے کو اس نے جیت لیا ہے، کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جب سے وہ ادبی دنیا میں آئی ہے ایک ہی مقدمہ لڑے جا رہی ہے۔ عصمت کو جھوٹ سے مکر و ریا سے سخت نفرت ہے۔ جسطرح وہ اپنی زندگی میں اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کی دہری زندگی کے بخیئے ادھیڑتی ہے۔ اسی طرح اپنے ادب میں سیاست سماج زندگی کے ہر شعبے میں گھس کر اپنے خاردار قلم سے ہر فریب کا پردہ چاک کر کے اس کے چیتھڑے بکھیر کے آپ کے سامنے رکھتی جاتی ہے اور ایک زہر خند طنزیہ تبسم سے کہتی چلی جاتی ہے یہ لو — یہ لو — یہ ہو تم، یہ ہو تم اب جو کرنا ہے کر لو تم جو مجھے کام کرنا تھا وہ میں کر چکی دیکھتی ہوں۔ تم میرا کیا بگاڑ لیتی ہو؟ — صرف یہی کہنے پر اکتفا نہیں کرتی اوپر سے ٹھینگا بھی دکھاتی ہے۔ جب سے وہ ادب کے میدان میں آئی ہے۔ اپنی ذاتی شہرت یا بدنامی کی پروا کئے بغیر لڑتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے اس مقدمے کا حشر کیا ہوگا میں نہیں کہہ سکتا۔ دراصل یہ مقدمہ عصمت کا اکیلا نہیں ہے اس سے کروڑوں لوگوں کی زندگیاں وابستہ ہیں۔

عصمت میں عورتوں والی عادتیں بہت کم ہیں۔ ساری زندگی وہ ایک مرد کی طرح لڑی ہے اور اسی طرح اس نے جدوجہد کی ہے۔ مگر ہے تو وہ عورت! اس نے پیار بھی کیا ہے، شادی بھی کی ہے۔ بچے بھی پیدا کئے ہیں گھرداری بھی کی ہے۔ مگر کس قسم کی عورت ہے وہ؟ آج تک اسکے آنسو

کسی نے نہیں دیکھے۔ یہ خوفناک زہرناکی اس کی تحریر میں کہاں سے آئی ؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جب غم کشید کیا جاتا ہے تو آنسو بن جاتا ہے ؟ اور جب آنسو مقطر کئے جاتے ہیں تو زہر کی بوندوں میں ڈھل جاتے ہیں ؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک حساس اور غم آشنا دل نے دنیا کی بے رحمی اور سخت گیری سے مجبور ہو کر اپنی روح کی نزاکت کو چھپانے کے لئے خار پشت کی کھال اوڑھ لی ہو ؟ میں نہیں کہہ سکتا ؟ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کسی کے دل کے اندر کی دنیا کو سمجھنا بہت مشکل ہے مگر ایک بار مجھے اس کے اندر کی دنیا کی ایک ہلکی سی جھلک ملی تھی اوائل گرمی کے دن تھے میں کچھ دنوں کے لئے بمبئی چھوڑ کر دہلی آیا تھا اور عصمت ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے دہلی آئی تھی اور ہمارے ہاں مہمان تھیں۔ دس دن ہم لوگ اکٹھے رہے ایک گھر میں ساتھ اٹھنا ساتھ بیٹھنا کھانا۔ پینا۔ گپ شپ، ہنسی مذاق میں، دعوتوں میں دلچسپ گفتگو میں، دن اپریل کے بادلوں کی طرح اڑے جا رہے تھے میں نے عصمت کو اس قدر شاداب اور مسرور موڈ میں نہیں دیکھا تھا یہ میری زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔ حالانکہ میں برسوں سے اسے جانتا ہوں

مگر ایک رات عجیب واقعہ ہوا۔ رات کے کھانے پر دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں اور دیر تک ہم سب لوگ ایک دوسرے کی باتوں سے محظوظ ہوتے رہے پھر اس مسرور موڈ میں ہم لوگ ایک دوسرے سے شب بخیر کہہ کر رخصت ہوئے اس شب گرمی کی تمازت کچھ زیادہ تھی

اس لئے عصمت نے صحن میں پنکھا لگوا کر سونے پر آمادگی ظاہر کی جس کا انتظام کر دیا گیا اور ہم لوگ اپنی اپنی خواب گاہ کو لوٹ گئے۔

آدھی رات کے قریب اچانک میری آنکھ کھل گئی، معلوم ہوا کہ صحن میں کوئی دھیرے دھیرے رو رہا ہے۔ وہ آواز میں نے پہچان لی اور پہچان کر میری ہمت نہیں پڑی کہ میں اپنے کمرے سے باہر نکلوں اینٹ اور سیمنٹ کی دیواروں کے پرے کان لگائے میں ان دبی دبی سسکیوں کو سنتا رہا جو اب دبی دبی آہوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ آج دھرتی کا سینہ پھٹ پڑے گا۔!

صبح ہم لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر حسب معمول ملے عصمت کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مگر کسی نے اس مسئلے پر بات نہ کی اشارہ تک نہ کیا صرف گھر کے ملازم نے گھر کی مالکن کو سرگوشی میں بتایا ——

"رات کو میم صاحب بہت روئی تھیں!

"میں نے کہا نا کہ میں نے آج تک عصمت کے آنسو نہیں دیکھے صرف سنے ہیں بہت جی چاہتا ہے پوچھوں، عصمت تم اس رات کیوں روئی تھیں؟ کس لئے وہ آنسو تھے اور کیسے؟ ایک عورت کے؟ ایک ماں کے؟ کہ دھرتی کے؟ —— بہت جی چاہتا ہے پوچھ لوں —— مگر دھرتی کی بیٹی سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی اگر کہیں اس نے سچ بول دیا تو اتنا بڑا سچ سہار لینے کی شکتی اس دنیا میں کس کے پاس ہے۔

زہر کا پیالہ

میرے پیدا ہونے کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی۔ مجھ سے پہلے پانچ بھائی اور تین بہنیں وارد ہو چکی تھیں۔

اماں بچوں سے دب چکی تھیں۔ دو چار بچوں تک تو وہ ماں بننے کی خوشیاں مناتی رہیں پر جب بچوں نے گھر ہی دیکھ لیا تو وہ ماں بننے کو سزا سمجھ کر جھیلنے لگیں۔

میرے ابا میاں کو بچہ بازی کی لت تھی۔ خواہ وہ مرغی کے چوزے ہوں یا کتے کے پلے وہ انہیں بڑے انہماک سے پالتے۔ جونہی چوزے انڈا کھٹک کر باہر آتے۔ ابا میاں کی کوشش ہوتی کہ جلد سے جلد انہیں علیحدہ کر دیں تاکہ مرغی کڑکی جھاڑ کر انڈے دینے لگے۔ اسی طرح جوں ہی بچہ پیدا ہوتا وہ آگرے سے ایک دودھارہ گولن کو بلوا کر بچہ اس سے ہلا دیتے اور اماں نئے جیو کی تیاری میں اُلجھ جاتیں۔

میری انا کا نام ٹیکو تھا۔ سانولی سلونی کمسن لونڈیا سی تھی۔ پہلوٹھی کا بچہ جن کر غریبی سے مقابلہ کرنے کے لیے چاول کی بیچ پر چھوڑ کر مجھے اپنا خون چٹانے آنا پڑا تھا۔

دو چار روز اپنے بچے کی یاد میں روتی پیٹی۔ پھر ذرا مرغن راتب ملا۔ کچھ دھمکیاں ملیں تو ہار جھک مار کر اپنی ڈیوٹی پر جٹ گئی۔

جب کبھی میں اپنی انا ٹیکو کا خیال کرتی ہوں تو میرا وجود شرم سے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ ادھر میں پھول پھول کر کپا ہوتی جا رہی تھی ادھر اس کا پہلوٹھی کا پوت رنجھ رنجھ کر موت کی طرف رینگ رہا تھا۔ جب چھ مہینے کے بعد وہ آگریے گئی تو اس کے کلیجے کا ٹکڑا سوکھ کر ہڈیوں کا ہار بن چکا تھا۔ یہ مٹکا سا پیٹ کھپچی سے ہاتھ پیر، اسے سوکھے کی بیماری بڑی تیزی سے نگل رہی تھی۔ جوئیں اس کے جسم پہ جونکوں کی طرح لپٹی رہا سہا خون چوس رہی تھیں۔ پلکوں تک میں لیکھیں بھر گئی تھیں۔ میں ہمک ہمک کر گھٹنوں چلنے لگی تھی اور وہ چھپکلی کے بیٹے کی طرح زرد مردار پسلی کے مرض میں مبتلا کھری کھاٹ پر پڑا سانس کی دھونکنی چلایا کرتا تھا اس کے جبڑے دودھ کھینچنے کی طاقت کھو چکے تھے۔ جب انا نے اس کے منہ میں دودھ دیا تو وہ اناڑیوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا اور میں نے رشک و حسد کی آگ میں بھسم ہو کر اسے کھسوٹ کر دور پھینک دیا اور خود جٹ گئی۔

انا سال میں دو بار اپنے گھر جاتی تھی۔ اس کے ساتھ مغلانی بی اور داروغہ جی مزید احتیاط کیلئے جاتے تھے۔ میں مغلانی کے ساتھ فرسٹ کلاس میں رکھی جاتی تھی

اور اسٹیشنوں پر انّا بھاگم بھاگ مجھے دودھ پلانے آیا کرتی تھی کوئی واڑے میں جب لاؤ لشکر پہنچتا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ جمعدار کے پاک صاف صحن میں بانس کی نئی کھاٹیں خرید کر ڈالی جاتیں۔ جس پر مغلانی بی اپنا صاف ستھرا بستر سجا کر ناک سکیڑ کر بیٹھ جاتیں۔ نیا چھینٹ کا لہنگا پہنے انّا ادھر اُدھر منڈلاتی پھرتیں۔ وہ جتنی کوشش اپنی اہمیت جتانے کی کرتی مغلانی بی بڑی صفائی سے کاٹ دیتیں اور رات کو اس ڈر سے کہ کہیں مردار اپنے خصم سے نہ مل بیٹھے اس کی کھاٹ کی پٹی سے ملا کر سوتیں باہر کنڈی چڑھا کر داروغہ جی ڈٹ جاتے۔ اگر پھر سے کہیں گابھن ہو بیٹھی تو دودھ زہر ہو جائے گا اور میں نگوڑی ہڑک جاؤں گی۔

رات کو انّا کا شوہر دارو پی کر آتا اور بہت دند مچاتا۔ اس کی آواز سنکر انّا گرم کتیا کی طرح بلبلا اٹھتی۔ مگر مغلانی بی کی مغلظات سن کر بس سسکیاں بھر کے دبک رہتی۔ شوہر خوب شور مچاتا۔ لوگ باگ اکٹھے ہو جاتے وہ ایک پل کو انّا کی صورت دیکھنے کے لئے گڑگڑاتا۔ اٹھارہ انیس برس کا لونڈا ہی تو تھا۔ بڑی منتوں سماجتوں سے داروغہ جی لیے اندر لاتے۔

"رانی!" وہ بھینسے کی طرح پھنکارتا

"سوامی!" انّا اس کے پیروں کو چھونے بڑھتی اور وہیں سب کے سامنے وہ بولانے کتوں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبوڑنے لگتے۔

داروغہ جی مغلانی اور اٹھ رلیے روی ٹکڑے درمیان میں کود پڑتے شوہر کو اس کے بھائی بند گھسیٹتے لے جاتے اور ٹیکو بے وقت ہی مجھے دودھ

پلانے پر لیشمہ ہو جاتی ۔ مگر دودھ میں جیسے زہر گھل جاتا اور میں واویلا مچانے لگتی ۔

صبح کی گاڑی سے پشتم پشتم واپس لوٹ آتے

دوسری دفعہ جب انا گھر گئی تو میں پیروں چلنے لگی تھی ۔ اس کا بچہ ننھوا بیٹھنے لگا تھا ۔ سوکھے کے ساتھ ہوتے کی بیماری اسے بھی لگ گئی تھی ۔ بس کھاتے چلا جاتا تھا ۔ خاک مٹی ، کوڑا کرکٹ ۔ مرغیوں کی بیٹ ۔ پھل ۔ ترکاری کے چھلکے ۔ غرض جو ہاتھ آ جاتا سوکھی سوکھی انگلیوں میں دبوچ کر منہ میں گھسیڑ لیتا ۔ اسی وجہ سے اسے مستقل دست آتے رہتے تھے ۔ اس کے چاروں طرف پتلی پتلی غلاظت کی ایک جھیل سی بن جاتی جس کے کنارے پر مکھیوں کی گوٹ جمتی رہتی ۔ بیچ میں وہ ایک سنسان بنجر جزیرے کی طرح ڈٹا رہتا

المونیم کا ایک ٹیڑھا کبڑا پیالہ اس کی کل جمع پونجی تھی ۔ اس پیالے سے اس کی کرب ناک زندگی کی جملہ رعنائیاں وابستہ تھیں ۔ یہ پیالہ اس کی ماں تھا اور یہی اس کا ان داتا ۔ اگر گھڑی بھر کو پیالہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ یتیموں کی طرح ہائے ویلا مچانے لگتا ۔ اسے کلیجے سے لگائے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی ۔

جب اسے بھوک لگتی جو ہر وقت ہی لگی رہتی تھی ۔ تو وہ دونوں ہاتھوں سے پیالہ بجاتا ۔ کبھی بندر کی طرح زمین پر گھستا ۔ مشاق فقیر کی طرح لوگوں کو دکھا کر اس میں کھانا ڈالنے کی تلقین کرتا ۔ کتنا بھی کھلا دو ازلی بھوک قائم رہتی ۔ کیونکہ معدہ اور آنتیں ڈھلان کی نالی کی طرح تھیں ۔ خوراک نہایت

تیزی سے دوڑتی بھاگتی اس کے پیٹ میں سے اچھوتی نکل جاتی اور پھر وہ خالی کا خالی رہ جاتا

یہ پیالہ اس کا کھلونا بھی تھا، ہمدم و دمساز بھی۔ گھنٹوں بیٹھا اسے سوکھے ہاتھوں سے ٹٹولا کرتا۔ جیسے بچے بسکٹ چباتے ہیں ایسے دودھ کے ننھے ننھے دانتوں سے اس کے کنارے چبایا کرتا۔ پھر وہیں غلاظت کی جھیل میں کٹورے پر منہ رکھ کے سو جاتا۔

ٹیکو کو دیکھ کر وہ بری طرح سہم گیا کہ کہیں وہ اس کا پیالہ تو نہیں چھیننے آگئی ہے۔ ذرا بھی خون نے جوش نہ مارا۔ اور ٹیکو کا خون اب اس کے جسم میں رہا بھی نہ تھا۔ کب کا جھیل میں بہہ چکا تھا۔

ٹیکو کو بھی اس پر ممتا نہ آئی۔ بلکہ شاید اس کے وجود سے شرم اور گھن آئی ہوگی۔ میں سفید ولایتی جوتیاں پہنے سارے صحن میں بیڑ بیڑ بھاگتی پھرتی تھی۔ محلہ ٹولے کی عورتیں یہ عجوبہ روزگار دیکھنے جوق در جوق آرہی تھیں۔ اور ٹیکو حق ملکیت جتانے کے لئے بار بار شلوکے کے بٹن کھول کر مجھے لبھا رہی تھی۔ اس کا جسم میری سب سے بڑی کمزوری تھا۔ کبھی بھولے سے بھی اس کے شلوکے کا بٹن کھل جاتا تو میں اس پر ٹوٹ پڑتی۔ وہ مجھے چڑانے کے لئے جسم کھولتی اور جب میں ہمک کر آتی تو شرارت سے اوندھی ہو جاتی اور میں بلک بلک کر اس کے نیچے گھسنے کی کوشش کرتی۔ وہ یہ تماشے لوگوں کو دکھاتی۔ پھر مجھے کلیجے سے لگا کر چومنے لگتی۔ دور اس کا بچہ جھیل کے بیچوں بیچ بیٹھا لوہے کے چنے چبایا کرتا۔

رات کو حسب معمول اس کے شوہر نے دنگا مچایا۔ خوب سی دارو چڑھا کر مستانے سانڈ کی طرح ڈکرانے لگا۔ خوب جی بھر کے گالیاں دیں اس نے میرے ابا میاں تک کو نہیں چھوڑا۔ انہیں ٹیکو کا یار بنا ڈالا۔ جب کسی پر بھی بس نہ چلا تو اپنی ماں کو لاتیں ماریں اور باپ کے سر پر لیٹھ جما دیا داروغہ جی نے فوراً ابا میاں کے دوست تھانیدار صاحب کو اطلاع دی۔ وہ جھٹ دو کانسٹبل لے کر موقعہ واردات پر پہنچے اور شوہر نامدار کو دنگا فساد کرنے کی پاداش میں پکڑ کر لے گئے۔ وہاں اس کی ایسی تاجپوشی ہوئی۔ کہ ہوی کا عشق ناک کے رستے نکل گیا۔

ادھر ٹیکو گھگھیا رہی تھی، رو رہی تھی، اور اس کے ساتھ میں بھی ہلکان ہو رہی تھی۔

مغلانی بی درود پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

اور ننوا ایسا لپیٹ رہا تھا جیسے وہ طبلِ جنگ ہو۔

میں کوئی ڈیڑھ برس کی تھی۔ اماں نئے جیو کو جنم دینے کے لئے بھری بیٹھی تھیں۔ اب کے چھ ماہی پر ٹیکو نے گھر جانے کی بات سنی ان سنی کر دی تھی۔ وہاں اس کے لئے سوائے کونت کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ گھر جاتے کتراتی تھی۔ پونے دو سال کی عمر میں میرا دودھ چھوٹ جاتے تو پھر انا کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔

کچھ دن سے انا بے انتہا چونچال ہو گئی تھی۔ بات بات پر ہنستی کھلکھلاتی راہ چلتوں کو چھیڑتی۔ مجھے لئے لئے گھومتی۔ کبھی باورچی سے ٹھٹول ہو رہی

ہے۔ کبھی دھوبی سے الجھ رہی ہے کہ للّی کے کپڑے ٹھیک سے نہ دھوتا۔

مگر میں دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ راتوں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی۔ اس کی بوٹیاں چباتی۔ ہر وقت اس کے شلوکے کے گرد منڈلاتی رہتی دوپہر کو عموماً مجھ سے والی کوٹھڑی میں ٹھنڈ ہوا کرتی اور وہ اپنی اوڑھنی بچھا کر مجھے اس پر سلا دیتی اور خود بیٹھی بیٹھی سر دل میں کجریاں الاپتی رہتی۔ شاید بچھونے کا کوئی تنکا چبھ گیا یا میری چھٹی حس نے جاگ کر مجھے جگا دیا۔

اگر کوئی کتا یا بلی کھانے کے خوان پر جٹا نظر آئے تو انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہی خاکسار کی ہوئی ہوگی۔ میری لاڈلی اناّ کے شلوکے کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور داروغہ جی ـــ

میری چیخوں کی آواز سنکر تمام نوکر دوڑ پڑے شاید بیٹا کو سانپ نے ڈس لیا۔ مگر سانپ کی جگہ اژدھا دیکھ کر لوگ بھونچکے رہ گئے۔ جب ہی میری انا کا دودھ زہر ہو رہا تھا۔

دودھ کی بوتل ٹوٹ جائے یا اسے کتا نجس کر دے تو کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیتے ہیں۔ ٹیکو کو پہلی گاڑی سے آگرہ روانہ کر دیا گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر جوڑے اماں کے قدموں پر ناک گھسی کہ اب وہ کسی کرم کی نہیں رہی اسے برادری میں کون گھسنے دے گا اور پھر داروغہ جی کا تحفہ وہ کس کے منہ پر مارے گی مگر سنوائی نہ ہوئی۔

میرے ابا میاں جو مجسٹریٹ تھے۔ اپنے انصاف اور حق پرستی کے لئے مشہور تھے

سوچتی ہوں تو عقل کام نہیں کرتی کہ انہوں نے میری اناکو کیسے نکال دیا۔
اس وقت وہ ساڑھے سترہ برس کی تھی۔ اس کی یاد میں مَیں نے اپنا کلیجہ نکال ڈالا۔ بہنیں مجھے کندھے سے لگائے رات رات بھر ٹہلتیں مگر میری انا کی یاد اس کے شلوکے کی گرم گرم مہک ہوک بن کر اٹھتی رہی اور میں روتی رہی۔
یادداشت کا پہلا صفحہ الٹتی ہوں تو دھند ہی دھند ہے کوئی میلا میلا بھورا سا ہیولیٰ سل پر کوئی سفید سفید چیز پیس رہا ہے شاید کھیر کے لئے چاول ہیں۔ دور کہیں کوئی تھکی ہاری عورت بین کر رہی ہے۔
"ہائے مورا پوت!"
میرے پاس تو توا کا پیالہ بھی نہیں جسے ٹٹول کر دل کی بھڑاس نکالوں بس میں روتی ہوں۔ کس کا پوت؟ کہاں چلا گیا؟ میں کچھ نہیں جانتی بس روتی ہوں۔
میں اپنی منجھلی بہن کے سینے سے لگی صدیوں سے رو رہی ہوں۔ میں اس کے گریبان کے بٹن ٹٹولتی ہوں۔ شرم سے سرخ ہو کر وہ مجھے دور پھینک دیتی ہے۔ میری اماں نظر بچا جاتی ہیں۔ میری باجی مجھے پھر اٹھا لیتی ہے۔
"نہیں! توبہ — توبہ!" وہ مجھے گریبان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر تنبیہہ کرتی ہے۔ "نہیں — توبہ —" میں تائید کرتی ہوں وہ ہنس پڑتی ہے نظروں کے سامنے سے رنگ برنگے قمقموں کی قطاریں ہنستی گذر جاتی ہیں۔ باریک باریک روشن سلائیں جال سا بنتی ہیں۔ میں بڑی ہو جاتی ہوں اب حلق پھاڑ کر چلانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر بھی چلاتی ہوں —

بھائیوں کی پلٹن کے ساتھ باغوں اور کھیتوں پر دھاوے بھی مارتی ہوں، کبھی خربوزوں کی فالیز پر تو کبھی کچی کیریوں کی دھن میں گھنی امریوں میں سر گرداں پھرتی ہوں۔ زندگی ایک شور ہے ایک سریلا ہنگامہ ہے جس کا ماحصل نوچ کھسوٹ اور گتھم گتھا۔ ایک چنگھاڑتے چیختے ماحول کا ایک پر ساز پر آواز حصہ میں بھی ہوں۔

خوب غل مچتا ہے برتن کھڑکھڑاتے ہیں ڈھول پٹتے ہیں گھنگرو بجتے ہیں اور باجی بیاہ کر چلی جاتی ہے

میں پھر یتیم رہ جاتی ہوں۔ جنگلوں جنگلوں ویران گھوم رہی ہوں۔ روح اور جسم پر میل کی پپڑیاں جمتی ہیں۔ میں کسی کی لاڈلی نہیں کسی کا بوجھ نہیں میری دادا گیری سے لوگ عاجز ہیں۔ مرغیوں کو کھدیڑنا کتوں کے ڈھیلے مارنا ہر ذی روح کو تنگ کرنا میرا مقصدِ حیات ہے۔ اماں جب پکڑ پاتی ہیں جی بھر کے میری دھول جھاڑتی ہیں اور اپنے جی کا غبار۔

آجکل کے والدین تو بچوں کی تربیت پر کتابیں پڑھتے ہیں میرے زمانے میں کتابوں سے بچوں کو ٹھوکا جاتا تھا بشرطیکہ وہ بہت موٹی ہوں۔

سب عاجز آ کر کہتے ہیں۔ کولن کی لونڈیا ہے اس کا خون رنگ لا رہا ہے۔

ہائے کولن مجھے پھینک کر کہاں چلی گئی۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ بس سانولی سلونی ٹھوڑی پر گودنے کے تین سیاہ نکتے مجھے یاد رہ گئے۔ اب بھی جب کبھی میں تین نکتے گدی ہوئی ٹھوڑی دیکھتی ہوں تو جی گھبرانے لگتا

ہے۔ تنہائی کا احساس امڈ آتا ہے۔

ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ میں بھینس والی بڑی اماں کی مرغیوں کو ستا رہی تھی۔ وہ ظہر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی تھیں اور سوائے توں توں کے بولنے سے معذور تھیں ایک دم میرے نام کی پکار پڑی۔ اماں کو بیٹھے بیٹھے مجھ پر پیار تو آیا نہ ہوگا پھر یہ کونسی سزا کی ادائیگی ہوگی۔

دالان میں اماں اپنی مخصوص جگہ بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں۔

اور ان کے پیر پکڑے وہ بیٹھی تھی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میرے دل پر دھائیں سے موگری پڑی۔ پیر پگھلنے لگے۔ ٹھوڑی کے تین نکتے! تین سنسناتی گولیاں — میرے حواس جاتے رہے۔ پلٹ کر بگٹٹ بھاگی۔

پر اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا۔

"ہائے موری چڑیا۔"

وہ مجھے ننھی ننھی سی چڑیا کی طرح ہانپتی ہوئی چھوڑ کے گئی تھی۔ اس نے مجھے گود میں اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ چت گری اور اوپر میں۔ میں جو گیارہ برس کی عمر میں اس سے لمبی اور چوڑی تھی۔

میں نے اس کے نیچے سے چھوٹنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے، نوچا کھسوٹا دھکے دیئے مگر نہ جانے میرے ہاتھوں میں ست کیوں نہ رہا۔ وہ مجھے دبوچ کر گلا پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔

اور میں بھی رونے لگی۔

میں نے لمحہ بھر کو خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا - یا خدا وہ مجبور لمحہ! وہ اُس کے شلوکے کی بھولی بسری مہک جیسے ماں کے پیٹ میں سو رہی ہوں - وہ مجھے گائے کی طرح چاٹ رہی تھی - دکھاوے کو میں اب بھی کسمسا رہی تھی مگر میری ساری طاقت اس کی گود میں پگھل چکی تھی - اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا - اب کیا کرے - ایک دم اس نے اپنے شلوکے کے بٹن کھول دیئے۔

"للّی دودھ پئے گی؟" اس نے میرے منہ میں دودھ ٹھونس دیا

جم غفیر جو مجھے گھیرے میں لئے تماشا دیکھ رہا تھا۔ قہقہے مارنے لگا۔ میں نے اسے زور کا دھکا دیا اور سر پٹ بھاگی۔

"بی بی جی ـــ للّی دودھ نا پیتی؟" اس نے اماں سے شکایت کی ۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے دودھ پینے سے انکار کر دیا ہے۔

میں غسلخانہ میں چھپ کر رو دی ٹیکو نے بھرے مجمع میں مجھے ذلیل کر کے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ سب نے مجھے اتنا چھیڑا کہ میں سسک سسک کر دعائیں مانگنے لگی اللہ ٹیکو مر جائے۔ مر جائے ۔مر جائے - ٹیکو اماں تو مر جائے ـــ ہائے ٹیکو اماں - ٹیکو میری چڑ بن گئی۔

مگر ٹیکو نہیں مری - وہ سال چھٹے مہینے میرے لئے المونیم کے پیالے میں چنے مرمرے شکر کے کھلونے ، بھونڈی مٹی کی گڑیاں اور ہاتھی گھوڑے لایا کرتی - وہ میری رگ پہچان گئی تھی - سب چھیڑتے ہیں اس لئے اکیلے میں دیا کرتی پھر بڑی رازداری سے پوچھتی

"للّی دودھ پئے گی؟"

میں روٹھ جاتی تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔

تب ہولے ہولے مجھے آپا اور اماں کی باتوں سے پتہ چلا کہ ٹھیکو کے میاں کو جب اس کے کرتوتوں کا پتہ چلا تو اس نے اسے اتنا مارا کہ بغیر دائی کی مدد کے اسے داروغہ جی کے تحفے سے نجات مل گئی۔ میاں نے ایک نٹنی ڈال لی تھی۔ ٹھیکو بال بچہ بھی نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ اس لئے اسے مار کر نکال دیا۔

ٹھیکو نے ننوا کو بہت رجھانے کی کوشش کی اسے دودھ بھی دینا چاہا۔ مگر عورت کی چھاتیاں اس کے لئے اجنبی تھیں۔ وہ اپنا پیالہ بجاتا رہا اور پھر اس پر منہ رکھ کر سو گیا۔ اور ایسا سویا کہ پھر جاگنے کی ضرورت نہ محسوس کی ——!

ٹھیکو اس پیالے سے سر پھوڑ پھوڑ کر روتی رہی۔ بین کرتی رہی یہ وہی زہر میں بجھا ہوا پیالہ تھا۔ جس میں میرے لئے کھیلیں بتاشے لایا کرتی تھی جس سے مجھے شدید گھن آتی تھی جیسے ننوا کے مردہ نیلے ہونٹ اب بھی اس کے کناروں پر رینگ رہے ہوں۔

پھر کئی سال کے لئے ٹھیکو غائب ہو گئی۔ اب مجھے اس سے پڑھ بھی آنا بند ہو گئی۔ اس بات پر بھی شرم نہیں آتی تھی کہ میں نے کولن کا دودھ پیا تھا کولن جس نے مجھے دودھ پلانے کے جرم میں اپنی زندگی کا سب کچھ ہار دیا تھا۔ کولن جو میری ماں تھی۔

پھر وہی چلچلاتی دھوپ بھری دوپہر تھی کہ گلی میں لونڈوں کا غل سنائی دیا۔ باؤلے کتوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے، گرتی پڑتی

دروازے دھڑدھڑاتی ایک جھرکٹ سی بڑھیا گھر میں داخل ہوئی۔

"رام کسن کھڑے ہمرے دوار، ہم لجّا سے جھکی جھکی جائیں"۔ اس نے بیچ صحن میں ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھ کر مٹکنا شروع کر دیا۔

میں نے کتنی کہانیاں لکھیں! ہنستی کھلکھلاتی، روتی بسورتی اور کاٹتی بھنبھوڑتی۔ انہیں لکھتے وقت ہنسی بھی ہوں اور روئی بھی۔ اپنا خون بھی کھولایا ہے۔ مگر ٹیکو ماں کا ذکر لکھتے وقت جو کرب اور جو جھلاہٹ میں محسوس کر رہی ہوں اسے لکھتے ہوئے میرا قلم دم چھوڑے دیتا ہے۔ چاہتی ہوں کہ وہ ٹیسوں کے بگولے جو میرے دماغ میں اٹھ رہے ہیں انہیں بانٹ کر ذرا اس بوجھ کو ہلکا کر دوں جو ہمیشہ ٹیکو کے تصور سے میرا دم گھونٹنے لگتا ہے مگر نہیں یہ میرے امکان میں نہیں

سب ہنس رہے تھے! وہ پاگلوں کی طرح ناچ رہی تھی۔ اس کا دودھ میری رگوں میں لاوا بن کر کھول رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھی سامنے جاکر کھڑی ہو گئی۔

ہمیشہ وہ مجھے دیکھ کر بہہ جایا کرتی تھی۔ آنکھوں میں مٹھاس بھر جاتی ممتا سے جسم نڈھال ہو جاتا۔

"میری چڑیا!" کہہ کر وہ میری طرف لپکتی اور میں چڑھ کر چھاگا کرتی۔

مگر اس دن اس کی آنکھوں میں زہر میں ڈوبی اجنبیت کے سوا کچھ نہ تھا لال لال آنکھوں میں ممتا کی چیتا دہک رہی تھی۔

اس کا گریباں ناف تک چاک تھا نرم گرم سانولے سینے کے بجائے لیترے جھول رہے تھے۔

"للّی دودھ نہ پئے گی؟" اس نے نہ پوچھا

اس کی بغل میں وہی المونیم کا پیالہ تھا جس کے کناروں پر ننوآ کے دانتوں کے نشان تھے اور جس میں وہ میرے لئے شکر کے کھلونے اور کھیلیں لایا کرتی تھی۔ وہ پیالہ زہر سے چھلک رہا تھا۔

"جے بوئی جہر بس پیالہ جو میں نے ننوآ کو دینا۔" پیالہ زمین پر اوندھا کر وہ ایک پیر سے کھڑی ہو کر گھوم گئی۔

ٹھوڑی پر گدے ہوئے تین سیاہ نکتے ترشول بن کر میرے کلیجے میں اتر گئے اور تمام کا تمام زہر جو اس کے وجود میں پھنکار رہا تھا ہولے ہولے ~~مجھ~~ میری روح میں رسنے لگا۔

لوگ تماشے سے اکتا کر اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے دور تک اس کے بین گونجتے رہے۔

"جے بوئی جہر بس پیالہ ـــــ"

پھر وہ کبھی نہیں آئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے۔ وہ زہر میں بجھا ہوا پیالہ کہاں ہے؟ جس کے کناروں پر ننوآ کے اودے اودے مردہ ہونٹ جنم جنم کی پیاس لئے اب بھی سسک رہے ہوں گے۔

جانی دشمن

عالیہ نے حیرت سے پرچے کو دوبارہ پڑھا۔ خالہ جان نے اسے بلایا تھا وہ اس کی خالہ جان خاک بھی نہ تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کی ماؤں نانیوں سے ایسے ہی خالہ، چچی، پھوپھی کا رشتہ لگالیا کرتی تھی۔ اس نے کچھ عادت ہی رشتہ جوڑ قسم کی پائی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی جو بہنا پے کرنا شروع کئے تو معلوم ہوا اپنی کلاس کی لڑکیاں تو خیر تھیں ہی۔ گھٹنہ پھوڑے کی ہر کلاس میں دوستی اور رشتے کا بیج بو ڈالا اور تو اور استادوں سے بھی بابا آدم کے رشتے سے میل جول بڑھالیا۔ پھل لئے چلی آرہی ہیں۔ ساڑھیاں کڑھوائے دیتی ہیں۔ سوئیٹر بن رہی ہیں اور دعوتوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں آج نذر نیاز ہے، تو کل کسی بھائی بھتیجے کا مونڈن یا سالگرہ کبھی دور دراز کے رشتہ داروں کی شادی کے رقعے بانٹتی پھر رہی ہیں تو ساتھ ساتھ دلہن دولہا دونوں کی طرف سے شرکت کے لئے اصرار کئے جاتی ہیں۔

جو جل کر انہیں چڑاتا، وہ انتقاماً اسی کے گلے پڑ جاتیں اور اتنی شدید دوستی کر کے چھوڑتیں کہ توبہ۔ کسی کو جھوٹی حاضری لگوانی ہو، آپ سینہ سپر۔ کسی کو اپنے یارِ غار سے ملنا ہے آپ ادھر اُدھر کے ناطے جوڑ جاڑ اپنے گھر میں دونوں کو بلانے پر بضد۔ کوئی چندہ جمع ہو رہا ہے عالیہ بیٹا سب سے آگے۔

"ارے بھئی تم ٹھیریں سنّی جماعت، شیعہ لڑکیوں کی مجلس سے واسطہ؟"

"اے اللہ قسم بڑا مزہ آئے گا مسرور فاطمہ کیا نوحے پڑھتی ہے کہ کلیجہ ہل ہل جاتا ہے۔"

"تو اب ہولی اور دیوالی بھی مناؤ گی؟" لوگ پوچھتے

"کیوں نہیں جی۔ ہمیں دیئے اچھے لگتے ہیں اور ہولی میں اللہ قسم۔ پچھلے سال نیر بھیا نے ڈامر مل دی تھی۔ اف! میری تو ساری چوٹی چیک کر جوناہو گئی تھی گیا گھنٹوں مٹی کے تیل سے اور نہ جانے کس کس سے گھسائی کی، مگر ہفتہ بھر تک بھتنیوں کی شکل لیئے پھری۔ ساری چوٹی غارت ہو گئی" وہ ایسے چٹخارے لے کر بیان کرتیں جیسے بھتنیوں کی سی شکل لئے پھرنا اور چوٹی غارت کروا بیٹھنا ہی مقصدِ زندگی ہو۔

"مگر خدا کے لیئے اب کرسمس کے لیئے تو چندہ نہ بٹورو۔ کم بخت انگریزوں کا تہوار ہے۔ اُدھر کھدر پہ جان دیئے دیتی ہو۔ گاندھی جی کے چرن چھونا حاصل زندگی سمجھتی ہو اور اِدھر ان کرنٹیوں کے ساتھ مل کر ـــــ"

"اے بھائی سٹرن نہ ہو۔ یہ موئی کالی کلوٹیاں انگریز کہاں سے ہو گئیں۔ اپنی نورا سویٹ انگریز ہے؟ موٹی کالی بھنڈ۔ تم دیکھنا کتنا مزا آئے گا سب کو

پریزنٹ ملیں گے۔ بون فائر کے گرد بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھائیں گے۔"
وہ جھوم اٹھتیں۔

اور کرسمس کے موقع پہ عالیہ بٹیا سارے بورڈنگ ہاؤس کو سر پہ اٹھا لیتیں۔ دنیا بھر کا سامان سارے محلے سے مانگ تانگ کر جوڑتیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بوکھلا لیتیں۔ پریزنٹ بن رہے ہیں۔ ہال سجایا جا رہا ہے۔ نشاط ہوسٹل سے لے کر میتری بھون تک گھوڑے کی چال دوڑے چلے جا رہی ہیں کپڑوں کی پوٹلیاں لئے بگٹٹ بھاگ رہی ہیں۔

"اے بھئی بے بی کی گرالسٹ کے لئے پینگوڑا کتنا سڑا ہوا ہے۔ اللہ کوئی پنی منگوا دو۔ ذرا اپنے تکیے سے سنیٹا کلاز کی ڈاڑھی کے لئے روئی دے دو۔"

اف کبھی جی چاہتا مارے سوریا کو۔ مگر پھر وہ ایسے بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگتی کہ سارا غصہ رفو چکر ہو جاتا۔

جس کا جی چاہے عالیہ بٹیا کو بے وقوف بنا کر الو سیدھا کر لے جس کا جی چاہے پھسلا کر جو چیز چاہے مانگ لے۔ امتحان کے زمانے میں ساری کتابیں نوٹس اور پیپر دوسرے مانگ لے جاتے۔ یہ لائبریری میں کتابوں سے سر مار رہی ہیں۔ ایک دفعہ تو کسی کو سوال حل کر کے دیتی ہوئی پکڑی گئیں۔ اگر دوسری کوئی ہوتی تو اسی وقت امتحان کے ہال سے نکال باہر کی جاتی۔ عالیہ بٹیا نے اپنی صاف ستھری ہوئی حیرت زدہ آنکھوں سے کچھ ایسے دیکھا کہ نگرانی کرنے والی ٹیچر مسکرا کر رہ گئی۔

عالیہ بٹیا تو باؤلی تھیں اور اس باؤلے پن کی جتنی سزا بھی انہیں ملتی، کم تھی۔ اپنی فیس لائیں مگر کوئی لڑکی بسورتی کہ میں آرڈر نہیں آیا بڑی مصیبت ہے۔ یہ جھٹ اس کی فیس دے دیتیں۔ پتہ نہیں انہیں اتنی تنبیہہ کی جاتی تھی کہ نہیں۔ کبھی پرنسپل کے دفتر سے منہ لٹکائے تو نکلتی دیکھی نہیں گئیں اور یہ نہیں کہ عالیہ بٹیا کوئی رئیس لکھ پتی کی بیٹی تھیں یتیم تھیں اور ماموں کے گھر رہتی تھی۔ وظیفوں سے تعلیم گھسٹ رہی تھی مگر دل تھا کہ معاذ اللہ! جیسے گنگا جمنا کا سنگم۔ کم بخت کی حماقتوں پر پیار آتا تھا۔

" رضو بٹیا نے پھر کوئی سورپن کیا جو خالہ جان نے بلا بھیجا" عالیہ بٹیا پریشان ہو کر سوچنے لگیں۔

رضیہ اتنی ہی بد ذات تھیں۔ جتنی یہ بھولی تھیں۔ نہایت خود غرض، بے حد الکلوتی اور لاڈلی۔ اماں اور ابا کی زندگی کا سہارا۔ دادا دادی کی آنکھوں کی ٹھنڈک۔ ننہیال کی لاڈوں بگاڑی۔ دولت کے نشے میں غرق اور لڑکیاں تو ان سے سیدھے منہ بات کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتی تھیں مگر عالیہ بٹیا تو ان پر بھی حسب عادت ٹوٹ پڑیں۔ لوگوں نے بہت سمجھایا بجھایا۔ خوشامدی اور چاپلوس کہا۔ خود رضیہ نے یہی سمجھا کہ وہ ان کی موٹر میں لفٹ لینے کے لئے مکھن چپڑ رہی ہیں۔ مگر وہ بھلا ماننے والی تھیں۔ کلیجہ نکال کر تھما دیا اور بالکل بے غرض۔ مجال ہے جو موٹر میں لفٹ لے جائیں۔ وہی اپنے رکشے میں کھچر کھچر کرتی آتی جاتیں۔

" نہیں بھنو۔ کلوا غریب کیا کہے گا" کلوا آپ کا چہیتا رکشہ والا تھا۔ جس کے ہر سال وہ راکھی باندھ کر ایک روپیہ نیگ پاکر جامے سے باہر ہو جایا کرتی تھیں۔ کلوا کچھ اور پیاروں سے کم لاڈلا نہیں تھا۔ ہاں فیضو درزی کی اور بات تھی۔ سارے بورڈنگ سے سلائی مانگ کر اسے دلواتی تھیں اس کی ایسی پبلسٹی کرتی تھیں کہ سب سمجھتے تھے اس پر لٹو ہیں۔ بوڑھا ہے تو کیا ہوا یہ بھی تو سڑن ہیں۔

مگر وہ لٹو کس پر نہیں تھیں، ان کی بوکھلا ہٹوں پر غصہ آتا تھا۔ مگر انہیں اس غصہ پر پیار آتا تھا۔ لشتم پشتم خالہ جان کے ہاں پہنچیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ رضو بٹیا کی ناک لال پکوڑا ہو رہی تھی خالہ جان ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔

" علو تمہارا کہا تو بہت مانت ہے رضو۔ تمہیں او کا سمجھاؤ" خالہ جان نے منہ بسور کر کہا۔ عالیہ بٹیا ہل گئیں۔

" او حرام جادے نادرو لے کے پیچھے ہلکان ہوئے رہی ہیں۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ بٹیا ہمری لاس پہ سے برات جیہے۔ ہم تم کا بھنگی کا دے دیہیں ملا"

" اے ہے خالہ جان ـــــ نادر میں ایسی کون سی برائی ہے؟ زندگی میں پہلی بار انہوں نے کسی کی عرضداشت میں عیب نکالا۔ ورنہ عادتاً انہیں خالہ جان اور نادر دونوں کی حمایت میں چکر گھنی ہو جانا چاہیے تھا۔ ان کا کلیجہ تو ہر کسی کے لئے پھٹنے لگتا تھا۔

" اے بٹیا، اُو نکما دوئی کوڑی کا جلاہا ـــــ اُو کی اتنی ہمت کہ ہمری بٹیا

کا پھکاٹے کے جانڈاد پہ دانت نکوسے "۔

یہاں عالیہ بٹیا قائل ہوگئیں۔ واقعی رضو بٹیا کی جائداد پر دانت نکوسنے کا نادر میاں کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مگر اب کیا کیا جائے، رضو بٹیا ایک دم دل کے ہاتھوں بے بس ہو چکی ہیں۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے نادر کے لئے جان دینے کو تیار ہیں۔

"اے ہے بھئی اللہ نہ کرے" عالیہ نے انہیں کلیجے سے لگا کر کہا۔

"نہیں سچ علو۔ اب ان کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اللہ ہمیں تھوڑی سی سنکھیا لا دو۔"

حسب عادت عالیہ بٹیا کہنے والی تھیں "ابھی لو یہ کون سی بڑی بات ہے مگر خودکشی کا خیال آیا تو لرز اٹھیں کہنے لگیں "تمہارے دشمن کھائیں سنکھیا۔ میں سمجھاتی ہوں خالہ جان کو۔"

مگر جب خالہ جان نے بھی اسے سنکھیا لانے کی فرمائش کی تو عالیہ بٹیا کے کلیجے پر آرے چلنے لگے۔ وہ جو کسی کے چہرے پر میل آتے دیکھ کر لرز اٹھتی ہوں خودکشی کی دھمکیوں سے ادھ مری نہ جائیں تو اور کیا کریں گی۔

دو تین دن تو ایسی ویران اور پراگندہ پھریں کہ ہم سب سمجھے چلو عالیہ بی کی مٹی عزیز ہو گئی۔ انہیں ضرور کسی نہایت بھیانک آدمی سے عشق ہو گیا ہے۔

"اے بھئی لعنت ہے عشق پر۔ یہاں پر کشتوں کے پشتے لگنے والے ہو رہے ہیں اور تم لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ مرجائے گی کم بخت رضو — یہ وہ

روہانسی ہو گئیں۔

"ارے تو شادی کر لے نادر سے۔ اس میں کیا ہے۔ وہ کوئی بچی تھوڑی ہی ہے"؟

"تو خالہ جان مر جائیں گی"۔

"ارے ہٹاؤ، کوئی نہیں مرتا۔ ارے اب تو لوگ ہیضہ طاعون کے مارے نہیں مرتے تو بے چارے عشق کی کیا بساط ہے"۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے اچھا تو کہوں جا کے رضو سے"؟

"کہنا کیا، بس بھگوا دو اسے نادر کے ساتھ"۔

مگر جب نہایت خوشی خوشی وہ رضو بٹیا کو بھگوانے پہنچیں اور وہ پسر گئیں۔ اور خاندان کی ناک لے دوڑیں۔ لیکن عالیہ بٹیا کوئی معمولی وکیل تھوڑی تھیں۔ انہوں نے رضو بٹیا کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ ایسے کہ انہیں نادر کے سوا ساتھ بھاگنے کے اور رشتے ناممکن نظر آنے لگے آخر انہوں نے دبی زبان سے اقرار کیا کہ بھاگ تو وہ بے شک جائیں مگر ــــ

"اور" مگر "نے اتنا بڑا منہ پھاڑ کر عالیہ بٹیا کو عجیب کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔ بٹیا بھاگیں تو جائداد سے قطعی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

"سو تو ہے ــــ مگر نادر کے لئے تو تم ہر قربانی دینے کو تیار ہو!" ــــ انہوں نے بیچ بچت شروع کر دی۔ یہی تو عالیہ بٹیا کی خرابی تھی کہ رات کو دن کہنا شروع کریں گی تو بس اڑیل ٹٹو کی طرح کہتی ہی چلی جائیں گی۔ ان کا کیا ہے وہ ماموں کے ٹکڑوں پر پلیں۔ انہوں نے وہ سکھ کہاں جھیلے جو بے چاری

رضو بٹیا کی گھٹی میں پڑ چکے ہیں۔ کھردی دری اور میلی توشک پر سونے والی نرم نرم گدّوں کی کم بخت عادت کو کیا جانے ؟ سال میں چھ جوڑوں میں گزر کرنے والی کو کیا پتہ کہ جب الماریاں کپڑوں سے اٹا اٹ ہو جائیں۔ تو لباس کے چناؤ میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ؛ علّو بٹیا کا ایک چپل پھٹ جاتا ہے تو کہیں جا کے دوسرا پہن سکتی ہیں۔ مگر وہ غریب جس کے پاس پچاس جوڑی جوتے ہوں وہی انتخاب کی دردسری کو سمجھ سکتی ہے

رضو جی کی مجبوریوں پر غور کر کے عالیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور خالہ جان کو راضی کرنے پر جٹ گئیں کہ وہ ہنسی خوشی کی بیٹی کی شادی نادر سے کر کے اسے کوئی عمدہ سی نوکری دلوا دیں۔

مگر خالہ جان مردار ایک اڑیل، ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

"تم اُدو کا سمجھاؤ ؟"

"کس کو ؟"

" اُدو کا نادر کا سمجھاؤ کہ بٹیا کو پھانسنے کا خیال چھوڑ دے "

حد ہو گئی ۔یعنی اتنی سیدھی سی بات اور علو بٹیا کو نہ سوجھی ! سچ تو ہے نادر کو کیوں نہ سمجھایا جائے ۔ سمجھ دار آدمی ہے ۔ ضرور سمجھ جائے گا۔

طاہتی خاک چھانتی تیرے میرے دکھیلے سے ملاقات کرنے پہنچیں ۔ خالہ جان کی حالتِ زار کا دردناک نقشہ کھینچا ۔ مگر وہ ظالم نہ پسیجا ۔ یہی کہے گیا ۔" وہ جہالت کا زمانہ گیا۔ جب والدین اولاد پر ظلم کیا کرتے تھے ۔"

"یوں نہ کہیئے۔" عالیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "والدین اور ظلم! حالانکہ انہیں والدین سے کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ بچپن ہی میں انہیں دونوں لاوارث چھوڑ گئے تھے۔ ایک دھندلی سی یاد باقی تھی۔ لامتناہی پیار اور شفقت کا ایک مٹا مٹا سا عکس دماغ کے کسی نرم و نازک حصہ پر اپنا داغ چھوڑ گیا تھا۔

"آپ کے والدین آپ پر سختی نہیں کرتے؟"

"والدین سختی کیسے کر سکتے ہیں؟ حالانکہ میرے والدین جب میں ذرا سی تھی جب ہی انتقال کر گئے ــــ ہاں بس یہی ایک ظلم انہوں نے مجھ پر کیا۔ کہ مجھے اپنی سختیوں سے محروم کر دیا۔"

"اوہ ــــ مجھے بڑا افسوس ہے"

پھر بڑے جوش و خروش سے وہ رضیہ اور خالہ جان کی وکالت کرنے لگیں۔

"آپ رضیہ کی بہن ہیں؟" نادر نے پوچھا۔

"بہن ہی سمجھ لیجئے"

"سمجھ لینے کی بھی اچھی کہی۔ گویا آپ بہن نہیں تو پھر آپ کا اُن سے کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میری کلاس میٹ ہے، بہن سے بھی بڑھ کر"

"اور ان کی اماں خالہ سے بھی بڑھ کر؟"

"جی"

"آپ کی کوئی سگی خالہ ہیں؟"

"جی نہیں — مگر ہوتیں تو —؟"

"اوہ سمجھا"

"تو آپ کوشش کریں گے کہ"

"کہ میں رضیہ کو بھلا دوں؟"

"جی"

"ان کی احمق والدہ کی خوشنودی کے لئے؟"

"جی ہاں دوسرے — رضیہ ابھی کم سن ہے اپنا بُرا بھلا نہیں سمجھتی"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟" نادر نے کٹتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی؟"

علو بٹیا بوکھلا گئیں۔ کم بخت کی کیسی گہری گہری آنکھیں لگتیں جیسے دو کنوئیں کہ آدمی ڈوبتا ہی چلا جائے۔ ہائے بے چاری رضو!

"خالہ جان نے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"جی ہاں"۔ علو بٹیا جلدی میں کہہ گئیں۔

"آپ کی عمر کیا ہوگی؟" اس نے وکیلوں جیسی جرح جاری رکھی۔

"جی؟ — مگر میری عمر سے اور رضیہ کی زندگی سے کیا واسطہ؟" وہ بڑی مستعدی سے بولیں۔

"یوں ہی میں نے پوچھا ہے"۔

"رضیہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔"

" بہت چھوٹی ہے ۔"

" ہاں یقیناً ہوگی ۔" عالیہ نے بڑے وقار سے کہا ۔

" یہی کوئی ڈیڑھ دو سال ؟"

" قطعی ۔"

" ہوں ۔۔۔ اچھا ایک بات بتائیے ۔۔۔ یہ آپ کی خالہ جان جو ہیں نا ۔ وہ ۔۔۔ وہ آپ کی کفیل ہیں ؟"

" نہیں مجھے اسکالرشپ ملتا ہے ۔ اوہ آپ غلط سمجھے ۔ ایسی کوئی بات نہیں ۔ میں اپنے ماموں میاں کے ساتھ رہتی ہوں ۔"

" وہ بھی آپ کی کسی کلاس فیلو کے باپ ہیں ؟"

" نہیں وہ میرے سگے ماموں ہیں ۔"

" تو پھر آپ جو رضیہ کو میرے چنگل سے چھڑانا چاہ رہی ہیں اس میں آپ کا کیا فائدہ ہے ؟ نادر نے بدتمیزی سے پوچھا ۔

" وہ میری بڑی پیاری دوست ہے ۔" عالیہ بٹیا اس قسم کے تحقیر آمیز جملے سننے کی عادی تھیں ۔ ان کے ماتھے پر شکن بھی نہ پڑی ۔

" آپ سمجھتی ہیں کہ میں اتنا خطرناک آدمی ہوں کہ رضیہ کو میرے چنگل سے چھڑانا ثواب کا کام ہے ؟ نادر کا چہرہ تمتما اٹھا ۔

" جی نہیں یہ بات تو نہیں ۔"

" میں خطرناک نہیں ؟"

" نہیں ۔ توبہ کیجئے ۔۔۔ آپ تو بڑے شریف آدمی ہیں مگر ۔۔۔"

"جی شکریہ ــــ ہاں مگر ــ"

"مگر یہ کہ آپ نکمے ـــ اوہ سوری ــ"

"کہتے کہتے تکلف کی کیا بات ہے ـ" نادر نے دانت پیس کر کہا۔

"نہ کمائیں نہ دھمائیں، رضیہ کی جائداد پر ــ" انہوں نے ہکلا کر سر جھکا لیا۔ کسی کو بھی سخت سست کہنے کی انہیں عادت نہ تھی۔

نادر کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے علو بٹیا کو کھری کھری سنا دیں کہ وہ خود چونکہ اوروں کی خیرات پر پلی ہیں۔ اس لئے انہیں سوا روپے کے اور کچھ نہیں نظر آتا۔ اپنی طرح دوسروں کو بھی سمجھتی ہیں۔

علو بٹیا نے بالکل برا نہیں مانا۔ واقعی وہ وظیفوں کے بل بوتے پر زندہ تھیں۔ اور وظیفے بھی ایک طرح کی خیر خیرات ہوتے ہیں۔

"ہوں! تو میرا اور رضیہ کا کوئی جوڑ نہیں ؟" نادر پھنکارا

"جی نہیں ـــ وہ نازوں کی پالی، عیش و عشرت کی عادی ہے ـ" بڑی ڈھٹائی سے علو بٹیا ڈٹی رہیں۔

"اچھا میرا اور آپ کا تو جوڑ ہے ـ" نادر کمینے پن پر اتر آیا۔ مگر بٹیا کچھ نہ سمجھیں جھٹ سے بولیں "جی ہاں ـ کیونکہ میں بقول آپ کے خیرات پر پلی ہوں۔ میرے لئے تو ماموں جان کہتے ہیں، بس کوئی شریف آدمی ـــ" ایک دم علو بٹیا چپ ہو گئیں کیونکہ نادر بدذاتی سے مسکرا رہا تھا۔ ہائے یہ کیا کہہ گئیں۔

"میں شریف آدمی ہوں ؟" اس نے آنکھیں ترچھی کر کے پوچھا۔

"جی ـــ" علو بٹیا بری طرح بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔

پکا لوفر ہے۔ رضیہ کی جان چھوٹی تو اب میرے پیچھے لگ گیا" انہوں نے ایک دم لائبریری میں دھڑا رونا شروع کیا۔ رضیہ کی جدائی میں نادر پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے انہیں دھمکی تھی کہ تم نے میری کٹی کروائی ہے اب تمہیں سنبھالو۔ نہیں تو چلائیں گومتی ہیں۔ رضو بٹیا منیر میاں کے بکچر پوسٹ کارڈ دیکھ دیکھ کر ہی نادر کو بھول چلی ہیں۔ اور اب نادر علّو بٹیا کا جانی دشمن ہو رہا ہے۔ ان کے گھر پر حملہ شروع کر دیا ہے۔ ماموں ممانی بجائے ڈانٹنے کے اور اس کی خاطر کرتے ہیں۔ علّو نے بہت چاہا کہ اسے نادر بھائی جان کہے۔ مگر اس نے واضح کر دیا کہ لفظ بھائی نہ استعمال کریں تو زیادہ موزوں رہے گا۔ ویسے یہ قاضی لوگ تو سب بھائی وائی کی دو لفظوں میں ایسی تیسی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور منیر میاں ہیں کہ آنے کا نام نہیں لیتے۔ اگر یہ کچھ جیں چیڑ کرتی ہیں تو نادر دھمکاتا ہے کہ وہ پھر رضو کو ورغلانے لگے گا۔ خیر سے بٹیا کا نکاح ہو جائے پھر مردود کو دھتا بتا دی جائے گی۔ مگر وہ تو انتقام لینے پر تلا ہوا ہے اور علّو بٹیا کی مٹی پلید کر کے رہیگا۔ کیوں کہ اس نے ماموں میاں کو پیغام بھی دے دیا ہے۔ جب انہوں نے کہا لڑکی سے پوچھ کر جواب دیں گے۔ تو نامراد بولا۔ میں نے ان کا عندیہ لے لیا ہے۔

"عندیہ کا بچہ!" علّو بٹیا دھاروں دھار روتی تھیں اور نادر کی جان کو کوستی تھیں۔

"بھئی یہ اچھی مصیبت ہے"۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ مل کر کوستے یوں ایک یتیم لڑکی کی زندگی کے درپے ہونا کہاں کی انسانیت ہے۔ کھسیانی بلی

کھمبا نوچے - رضیہ بی نے پتہ کاٹ دیا تو وہ اس بے چاری کا دشمن ہو گیا۔

دو دن علو بٹیا غائب رہیں - پھر جو کالج آئیں تو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ پٹی ہوئی صورت جیسے مہینوں کی بیمار۔ جھکی جھکی روئی ہوئی آنکھیں۔ سر پر دوپٹہ زور سے منڈھے - لڑکیوں نے عیادت کی غرض سے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دوپٹہ سرکایا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے - مانگ قوس قزح بنی ہوئی جگمگا رہی تھی - مٹھیاں کھولیں تو ارمانوں کا خون حنا کا رنگ باندھ رہا تھا۔ اُف!

اور علو بٹیا ایک ایک کے گلے لگ کر سسک رہی تھیں۔

"صبر کرو علو پیاری" سب نے تسلی دی۔

"کیسے صبر کروں، میری بہن، اس نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کا نہ رکھا جانے خالہ جان میرے جہیز ہی کھٹوک رہی ہیں اس شخص کی مکاری دیکھو۔ ماموں میاں تک کو نہ بتایا کہ مڈل ایسٹ میں کوئی ڈیڑھ ہزار کی نوکری لگ گئی ہے .... منیر میاں نے اٹلی ہی میں کسی فرنگن سے شادی کر ڈالی۔ اب خالہ جان کوس رہی ہیں کہ ہیں نے ان کی رضو کے منگیتر کو ورغلا کر خود پھانس لیا۔

علو بٹیا ہچکیوں سے روتی رہیں اور امتحان کے بعد ان کا جانی دشمن انہیں لے کر مڈل ایسٹ کی طرف اڑ گیا۔

ہندوستان چھوڑ دو!

"صاحب مرگیا" جینت رام نے بازار سے سودے کے ساتھ یہ خبر دی۔

"صاحب! کون سا صاحب؟"

"وہ کانڑیا صاحب تھا نا—"

"اوہ کانا صاحب جیکسن۔ بیچارا—" میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کائی لگی پرانی جگہ جگہ سے کھونڈی بتیسی کی طرح منہدم ہوتی ہوئی دیوار کے اس پار ادھڑے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر سکھو بائی پیر پسارے بیٹھی مراہٹی زبان میں بین کر رہی تھی۔ اس کے پاس پٹو اکڑوں بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ پٹو یعنی پیٹر کالے گورے میل کا نادر نمونہ تھا۔ اس کی آنکھیں جیکسن صاحب کی طرح نیلی اور بال بھورے تھے۔ رنگ گندمی تھا

جو دھوپ میں جل کر بالکل تانبے جیسا ہو گیا تھا۔

اسی کھڑکی میں سے کئی برسوں سے اس عجیب و غریب خاندان کو دیکھتی آئی ہوں۔ یہیں بیٹھ کر میری جیکسن سے پہلی مرتبہ بات چیت شروع ہوئی تھی۔

سن بیالیس؁ کا "ہندوستان چھوڑ دو" کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ گرانٹ روڈ سے دادر تک کا سفر ملک کی بے چینی کا ایک مختصر مگر جاندار نمونہ ثابت ہوا تھا۔ منگٹن روڈ کے ناکے پر ایک بڑا سا الاؤ جل رہا تھا۔ جس میں راہ چلتوں کی ٹائیاں ہیٹ اور کبھی موڈ آجاتا تو پتلونیں اتار کر جلائی جا رہی تھیں سین کچھ بچگانا سہی مگر دلچسپ تھا۔ بچھے دار ٹائیاں نئے طرح دار ہیٹ، استری کی ہوئی پتلونیں بڑی بے دردی سے آگ میں جھونکی جا رہی تھیں پھٹے چیتھڑے پہنے آتش باز نئے نئے کپڑوں کو نہایت بے تکلفی سے آگ میں جھونک رہے تھے۔ ایک لمحے کو بھی تو کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آرہا تھا کہ نئی گیبرڈین کی پتلون کو آگ کے منہ میں جھونکنے کے بجائے اپنی ننگی سیاہ ٹانگوں پر ہی چڑھا لے۔

اتنے میں ملٹری ٹرک آ گئی تھی۔ جس میں سے لال بھبوکا تھوتھنیوں والے گورے ہاتھوں میں مشین گنیں سنبھالے دھما دھم کودنے لگے۔ مجمع ایک دم پھُر سے نہ جانے کہاں اڑ گیا تھا۔ میں نے یہ تماشا میونسپل دفتر کے محفوظ احاطے سے دیکھا تھا اور مشین گنیں دیکھ کر میں جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گئی تھی۔

ریل کے ڈبوں میں بھی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بمبئی سنٹرل سے جب ریل چلی تھی تو ڈبہ کی آٹھ سیٹوں میں سے صرف تین سلامت تھیں۔ لوئر پریل تک وہ تینوں بھی اکھیڑ کر باہر پھینک دی گئیں اور میں راستہ بھر کھڑی دادر آئی۔ مجھے ان چھوکروں پہ قطعی کوئی غصہ نہیں آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا یہ ساری ریلیں یہ ٹائیاں۔ پتلونیں ہماری نہیں دشمن کی ہیں۔ ان کے ساتھ ہم دشمن کو بھی بھون رہے ہیں۔ اٹھا کر پھینک رہے ہیں۔ میرے گھر کے قریب ہی سڑک کے بیچوں بیچ ٹریفک روکنے کے لئے ایک پیڑ کا لمبا سا گدھا سڑک پر لمبا لمبا ڈال کر اس پر کوڑے کرکٹ کی اچھی خاصی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ میں بہ مشکل اسے پھلانگ کر اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی تھی کہ ملٹری ٹرک آگئے اور جو پہلا گورا اسٹین گن لئے دھم سے کودا تھا۔ وہ جیکسن صاحب ہی تھا۔ ٹرک کی آمد کی خبر سنتے ہی سڑک پہ روک باندھنے والا دستہ ادھر ادھر بلڈنگوں میں سٹک گیا تھا۔

میرا فلیٹ چونکہ سب سے نچلی منزل تھا۔ لہذا بہت سے چھوکرے ایک دم ریلا کر کے گھس آئے۔ کچھ باورچی خانہ میں گھس گئے۔ کچھ غسل خانہ اور سنڈاس میں دبک گئے۔

چونکہ میرا دروازہ کھلا تھا اس لئے جیکسن معہ دو مسلح گوروں کے مجھ سے ہی جواب طلب کرنے آگے آیا۔

"تمہارے گھر میں بدمعاش چھپے ہیں انہیں ہمارے سپرد کرو۔"

"میرے گھر میں تو کوئی نہیں۔ صرف میرے نوکر ہیں۔" میں نے بڑی

لاپروائی سے کہا۔

"کون ہیں تمہارے نوکر؟"

"یہ تینوں ——" میں نے تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو برتن کھڑ پھڑ کر رہے تھے؟

"غسل خانہ میں کون ہے؟"

"میری ساس نہا رہی ہیں" میری ساس نہ جانے اس وقت کہاں ہوں گی۔

"اور پاخانہ میں؟" اس کے چہرے پر کچھ شرارت کی جھپکی آئی۔

"میری ماں ہوگی یا شاید بہن ہو ——مجھے کیا پتہ میں تو ابھی باہر سے آئی ہوں"؟

"پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ غسل خانہ میں تمہاری ساس ہے؟"

"میں داخل ہوتی —— تو انہوں نے آواز دے کر مجھ سے تولیہ مانگا تھا"؟

"ہوں —— اپنی ساس سے کہہ دو۔ سڑک روکنا جرم ہے!" اس نے دبی آواز میں کہا اور اپنے ساتھیوں کو جنہیں وہ باہر کھڑا کر آیا تھا۔ واپس ٹرک میں جانے کو کہا۔

"ہوں —— ا ہوں ہوں ——" وہ گردن ہلا کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں میں پر معنی جگنو جگمگا رہے تھے۔

جیکسن کا بنگلہ میرے احاطے سے ملحقہ زمین پر تھا۔ مغربی رخ پر سمت رکھتا۔ اس کی میم صاحب معہ دو بچوں کے ان دنوں ہندوستان

آئی ہوئی تھی - بڑی لڑکی جوان تھی اور چھوٹی بارہ تیرہ برس کی - میم صاحب صرف چھٹیوں میں تھوڑے دنوں کے لئے ہندوستان آجاتی تھی - اس کے آتے ہی بنگلہ کا حلیہ بدل جایا کرتا تھا - نوکر چاق چوبند ہو جاتے - اندر باہر صفائی ہوتی باغ میں نئے گملے مہیا کئے جاتے - جو میم صاحب کے جاتے ہی پاس پڑوس کے لوگ چرانا شروع کر دیتے - کچھ مالی بیچ ڈالتا اور دوبارہ جب میم صاحب کی آمد کا غلغلہ مچتا تو صاحب پھر وکٹوریہ گارڈن سے گملے اٹھوا لاتا -

جتنے دن میم صاحب رہتی نوکر باوردی نظر آتے - صاحب بھی یونیفارم ڈاٹے رہتا - نہایت عمدہ ڈریسنگ گاؤن پہنے صاف ستھرے کتوں کے ساتھ پھولوں کا بالکل اس طرح معائنہ کرتا پھرتا - گویا وہ سو فی صدی صاحب لوگوں میں سے ہے -!

مگر میم صاحب کے جاتے ہی وہ اطمینان کی سانس لے کر دفتر جاتا - ڈیوٹی کے بعد نیکر اور بنیان پہنے چبوترے پر کرسی ڈالے بیئر پیا کرتا — اور شاید اس کا ڈریسنگ گاؤن اس کا بیرا چرا لے جاتا - کتے تو میم صاحب کے ساتھ ہی چلے جاتے - دو چار ڈیری کتے بنگلے کو یتیم سمجھ کر احاطے میں ڈیرا ڈال دیتے -!

میم صاحب جتنے دن رہتی - ڈنر پارٹیوں کا زور رہتا اور وہ صبح ہی صبح پنجم سروں میں اپنی آیا کو آواز دیتی -

"ایگو - ووو"

"جی میم صاحب!

آیا اس کی آواز پر تڑپ کر دوڑتی - مگر جب میم صاحب چلی جاتی تو لوگوں کا کہنا تھا کہ آیا بیگم بن بیٹھتی - وہ اس کی غیر حاضری میں عوضی بھگتا یا کرتی تھی - فلو بیٹا اور پٹو اسی عارضی راج کے مستقل ثبوت تھے۔

کچھ "ہندوستان چھوڑ دو" کا ہنگامہ اور کچھ میم صاحب اکتا گئی تھی - اس گندے بچھاتے ملک اور اس کے باسیوں سے اس لئے وہ جلد ہی وطن سدھار گئیں - انہیں دنوں پھر میری ملاقات جیکسن صاحب سے اسی کھڑکی کے ذریعہ ہوئی۔

" تمہارا سالس نہا چکا ؟" اس نے بمبئی کی زبان میں بد ذاتی سے مسکرا کر پوچھا۔

" ہاں صاحب ــــ نہا چکا ـــ خون کا غسل کیا اس نے !" میں نے تلخی سے کہا۔ چودہ چودہ برس کے چند بچے کچھ ہی دن پہلے ہری نواس پر جو گولی چلی تھی - اس میں مارے گئے تھے - مجھے یقین تھا کہ ان میں کچھ وہی بچے ہوں جو اس دن جب ٹرک آگئی تھی تو میرے گھر میں چھپ گئے تھے - مجھے صاحب سے گھن آنے لگی تھی - برٹش سامراج کا جیتا جاگتا ہتھیار میرے سامنے کھڑا ان بے گناہوں کے خون کا مذاق اڑا رہا تھا - جو اس کے ہاتھ سے مارے گئے تھے - میرا جی چاہا اس کا منہ نوچ لوں - اس کی کونسی آنکھ شیشے کی تھی یہ اندازہ لگانا میرے لئے مشکل تھا - کیونکہ وہ شیشے والی آنکھ ولایتی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ تھی ـــــ اس میں ساری جیکسن کی سفید قوم کی چالبازی بھری ہوئی تھی - احساس برتری کا زہر دونوں ہی آنکھوں میں برابر رچا ہوا تھا - میں نے

دھڑ سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔

مجھے سکھو بائی پر بھی بہت غصہ آتا تھا۔ سور کی بچی سفید قوم کے ذلیل کتے کا ترنوالہ بنی ہوئی تھی۔ کیا خود اس کے ملک میں کوڑھیوں اور حرامزادوں کی کمی تھی۔ جو وہ ملک کی غیرت کے نیلام پر تل گئی تھی۔ روز جیکسن شراب پی کر اس کی ٹھکائی کرتا۔ ملک میں بڑے بڑے معرکے سر کیے جا رہے تھے۔ سفید حاکم بس چند دنوں کے مہمان تھے۔

"بس اب چل چلاؤ ہے ان کی حکومت کا۔" کچھ لوگ کہتے۔

"اجی یہ شیخ چلی کے خواب ہیں۔ انہیں نکالنا مذاق نہیں۔" دوسرے لوگ کہتے۔ اور میں ملک کے نیتاؤں کی لمبی چوڑی تقریریں سن کر سوچتی "کوئی جیکسن کا نے صاحب کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ مزے سے سکھو بائی کے جھونٹے پکڑ کر پیٹتا ہے۔ فلومینا اور ٹپو کو مارتا ہے۔ جے ہند کے نعرے لگانے والے اس کم بخت کا کچھ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔

مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ پچھواڑے شراب بنتی تھی مجھے معلوم تھا سب کچھ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سنا تھا کہ اگر ان غنڈوں کی رپورٹ کر دو تو یہ جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ ویسے مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ کس سے رپورٹ کروں۔ ساری بلڈنگ کے نل دن رات ٹپکتے تھے۔ موریاں سڑ رہی تھیں۔ مگر مجھے قطعی نہیں علم تھا۔ کہ کہاں اور کس سے رپورٹ کی جاتی ہے۔ آس پاس رہنے والوں میں بھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اگر کوئی بد ذات عورت اوپر سے سر پر کوڑے کا ٹین الٹ دے تو اس کی کس سے شکایت کرو۔ ایسے موقعوں پر عموماً جس کے سر

پر کوڑا کرتا۔ وہ منہ اونچا کر کے کھڑکیوں کو گالیاں دیتا کپڑے جھاڑتا اپنی راہ لیتا۔

میں نے موقع پاکر ایک دن سکھو بائی کو پکڑا۔

"کیوں کم بخت! یہ پاجی تمہیں روز پیٹتا ہے تجھے شرم بھی نہیں آتی۔"

"روج کبھی مارتا بائی؟" وہ بحث کرنے لگی۔

"خیر وہ مہینے میں چار پانچ دفعہ تو مارتا ہے نا!"

"ہاں مارتا ہے بائی ـــ سو ہم بھی سالے کو مارتا ہے۔" وہ ہنسیں

"چل جھوٹی ـــ"

"ارے پٹو کا سوگند ـــ ہم تھوڑا مار دیا سالا کو پرسوں۔"

"مگر تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ سفید چمڑی والے کی جوتیاں سہتی ہے؟" میں نے ایک سچے وطن پرست کی طرح جوش میں آکر اسے لکچر دے ڈالا۔ "ان لیڈروں نے ہمارے ملک کو کتنا لوٹا ہے ـــ" وغیرہ وغیرہ

"ارے بائی کیا بات کرتا ہے تم۔ صاب سالا کوئی کو نہیں لوٹا۔ یہ جو موالی لوگ ہے نا یہ بیچارا کو دن رات لوٹتا۔ میم صاحب گیا پیچھے سب کٹلری پھٹکری بیرا لوگ پار کر دیا۔ اکھا پاٹلوں، کوٹ، ہیٹ، اتنا فسٹ کلاس جوتا ـــ سب کھتم ـــ دیکھو چل کے بنگلے میں کوچھ بھی نہیں چھوڑا۔ تم کہتا چور ہے صاب۔ ہم بولتا ہم نہیں ہووے تو سالا اس کا بوٹی کاٹ کے لے جاوے اے لوگ۔"

"مگر تمہیں کیوں اس کا اتنا درد ہے؟"

"کائیکو نہیں ہووے درد وہ ہمارا مرد ہے نا بائی ـــ" سکھو بائی مسکرائی

"اور میم صاحب؟"

"میم صاحب سالی پکی چھنال ہاں ——!" سکھو بائی نے فیصلہ کیا۔ "ہم اس کو اچھی طرح جانتا ہے —— ہاں —— لنڈن میں اس کا لونت یار ہے" یہاں سکھو بائی نے موٹی ڈسی گالی دے کر کہا —— "وہیں مری رہتی ہے۔ آتی بی نئیں۔ پن آتی تو اکھا دن صاحب سے کھِٹ کھِٹ نوکر لوگ سے کھِٹ کھِٹ۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب انگریز ہندوستان جا رہے ہیں صاحب بھی چلا جائے گا۔ مگر وہ قطعی نہیں سمجھی۔ یہی کہتی رہی۔ "صاب ہم کو چھوڑ کے کیا جائے گا —— بائی اس کو بلایت ایک دم پسند نہیں۔"

کچھ سال کے لئے مجھے پونا رہنا پڑا۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ پھر واقعی انگریز چلے گئے —— ملک کا بٹوارہ ہوا۔ سفید حاکم ہٹے ہوئی چال چل گیا اور ملک خون کی لہروں میں نہا گیا۔

جب بمبئی واپس آئی تو بنگلہ کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ صاحب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا بنگلے میں ایک رفیوجی خاندان آبسا تھا۔ باہر نوکروں کے کوارٹروں میں سے ایک کوٹھڑی میں سکھو بائی رہنے لگی تھی۔ فلومینا خاصی لمبی ہو گئی تھی۔ پٹو اور وہ ماہم کے قریب ایک یتیم خانے میں پڑھنے جاتے تھے۔

جیسے ہی سکھو بائی کو میرے آنے کی خبر ملی فوراً ہاتھ میں دو چار مونگنے کی پھلیاں لئے آن دھمکی۔

"کیسا ہے بائی؟" انہوں نے رسماً میرے گھٹنے دبا کر پوچھا۔

"تم کیسا ہے۔ صاحب کہاں ہے تمہارا؟ —— چلا گیا نا لنڈن!"

"نئیں بائی ——" سکھو بائی کا منہ سوکھ گیا۔ "ہم بولا کبھی جانے کو پر نئیں گیا۔

اس کا نوکری بھی کھلاس ہو گیا تھا۔ آرڈر بھی آیا پر نہیں گیا۔

"پھر کہاں ہے؟"

"ہسپتال میں!"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"ڈاکٹر لوگ بولتا ۔۔ کہ دارو بہت پیا ۔۔ اس کے کارن مستک پھر گیا ۔۔ ادھر پاگل صاب لوگ کا ہسپتل ہے ۔ اچا ایک دم فرسٹ کلاس ادھر اس کو ڈالا۔"

"مگر وہ تو واپس جانے والا تھا۔"

"کتنا سب لوگ بولا ۔۔ ہم بھی بولا ۔۔ بابا چلا جاؤ۔" سکھو بائی رو پڑیں ۔۔ "پن نہیں، ہم کو بولا سکھو ڈالنگ تیرے کو چھوڑ کر نہیں جائیں گا ۔"

نہ جانے سکھو بائی کو روتے دیکھ کر مجھے کیا ہو گیا ۔ میں بالکل بھول گئی کہ صاحب ایک غاصب قوم کا فرد ہے جس نے فوج میں بھرتی ہو کر میرے ملک کی غلامی کی زنجیروں کو پیرا کر دیا تھا۔ جس نے میرے ہموطن بچوں پر گولیاں چلائی تھیں نہتے لوگوں پر مشین گنوں سے آگ برسائی تھی ۔ برٹش سامراج کے ان گھناؤنے کل پرزوں میں سے تھا جس نے میرے دیس کے جانبازوں کا خون سڑکوں پر بہایا تھا۔ صرف اس قصور میں کہ وہ اپنا حق مانگتے تھے ۔ عزت سے جینا چاہتے تھے ۔ مگر مجھے اس وقت کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے سکھو بائی کا مرد پاگل خانہ میں تھا۔ مجھے اپنے جذباتی ہونے پر بہت دکھ تھا کیونکہ ایک قوم پرست کو جابر قوم کے ایک فرد سے قطعی کسی قسم کی ہمدردی یا لگاؤ نہ محسوس کرنا چاہیئے۔

میں ہی نہیں سب ہی بھول چکے تھے ۔ محلے کے سارے لونڈے نیلی آنکھوں والی

نلو بینا پر بغیر یہ سوچے سمجھے فدا تھے کہ وہ کیڑا جس سے اس کی ہستی وجود میں آئی سفید تھا یا کالا۔ جب وہ اسکول سے لوٹتی تو کتنی ہی ٹھنڈی سانسیں اس کے جلو میں ہوتیں کتنی ہی نگاہیں اس کے پیروں تلے بچھائی جاتیں۔ کسی لونڈے کو اس کے عشق میں سر دُھنتے وقت قطعی یہ یاد نہ رہتا تھا۔ کہ یہ اسی سفید درندے کی لڑکی ہے جس نے ہری نواس کے ناکے پر چودہ برس کے بچے کو خون میں ڈبو کر مارا تھا۔ جس نے ماہم چرچ کے سامنے نہتی عورتوں پر گولیاں چلائی تھیں، کیونکہ وہ نعرے لگا رہی تھیں "ہندوستان چھوڑ دو!"

جس نے چوپاٹی کی ریت میں جوانوں کا خون نچوڑا تھا اور سیکرٹریٹ کے سامنے سوکھے مارے ننگے بھوکے لڑکوں کے جلوس کو مشین گنوں سے درہم برہم کیا تھا وہ سب بھول چکے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ گندمی گالوں اور نیلی آنکھوں والی چھوکری کی کمر میں غضب کی لچک ہے۔ موٹے موٹے گدرائے ہوئے ہونٹوں کی جنبش میں موتی رُلتے ہیں۔

ایک دن سکھو بائی جھولی میں پرساد لئے ہوئے بھاگی بھاگی آئی۔

"ہمارا صاب آگیا۔" ان کی آواز لرز رہی تھی، آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے کتنا پیار تھا اس لفظ "ہمارا" میں۔ زندگی میں ایک بار کسی کو یوں جی جان کا دم نچوڑ کر اپنا کہنے کا موقع مل جائے تو پھر جنم لینے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

"اچھا ہو گیا؟"

"ارے بائی پاگل کبھی تھا؟ ایسا ہیچ صاب لوگ پکڑ کو لے گیا تھا، بھاگ آیا۔"

وہ راز داری کے لہجے میں بولیں۔

میں ڈر گئی کہ کوبھی ایک تو ہارا ہوا انگریز اوپر سے پاگل خانہ سے بھاگا ہوا۔ کس کو رپورٹ کروں۔ بمبئی کی پولیس کے لفڑے میں کون پڑتا پھرے۔ ہوا کرے پاگل میری بلا سے۔ کون مجھے اس سے میل جول بڑھانا ہے۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ مجھے میل جول بڑھانا پڑا۔ میرے دل میں بھی کھدبد ہو رہی تھی۔ کہ کسی طرح پوچھوں جیکسن انگلستان اپنے بیوی، بچوں کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ بھلا ایسا بھی کوئی انسان ہوگا جو فردوس کو چھوڑ کر یوں ایک کھولی میں پڑا رہے۔ اور ایک دن مجھے موقع مل ہی گیا۔ کچھ دن تو وہ کوٹھڑی سے باہر ہی نہ نکلا پھر آہستہ آہستہ نکل کر چوکھٹ پر بیٹھنے لگا۔ وہ سوکھ کر چھوہرچ ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ جو پہلے بندر کی طرح لال چقندر تھا جھلس کر کتھئی ہو گیا تھا۔ بال سفید ہو گئے تھے چارخانہ کی لنگی باندھے میلا بنیان چڑھائے وہ بالکل ہندوستان کی گلیوں میں گھومتے پرانے گورکھوں جیسا لگتا تھا۔ اس کی نقلی اور اصلی آنکھ میں فرق معلوم ہونے لگا تھا۔ شیشہ تو اب بھی ویسا ہی چمکدار۔ شفاف اور "انگریز" تھا۔ مگر اصلی آنکھ گدلی بے رونق ہو کر ذرا دب گئی تھی۔ عموماً وہ شیشے والی آنکھ کے بغیر ہی گھوما کرتا تھا۔ ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو وہ جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑا کھوئے کھوئے انداز میں کبھی زمین سے کوئی کنکر اٹھاتا، اسے بچوں کی طرح دیکھ کر مسکراتا پھر پوری طاقت سے اسے دور پھینک دیتا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور سر ہلانے لگا۔

"کیسی طبیعت ہے صاحب؟" تجسس نے اکسایا تو میں نے پوچھا۔

"اچھا ہے۔ اچھا ہے" وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرنے لگا۔

میں نے باہر جا کر اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ جلد ہی وہ مجھ سے باتیں کرنے میں بے تکلفی سی محسوس کرنے لگا۔ پھر ایک دن میں نے موقع پا کر کریدنا شروع کیا۔ کئی دن کی جانفشانی کے بعد مجھے معلوم ہُوا کہ وہ ایک شریف زادی کا ناجائز بیٹا تھا۔ اس کے نانا نے ایک کسان کو کچھ روپیہ دے دلا کر پالنے پر راضی کر لیا۔ مگر یہ معاملہ اس صفائی سے کیا گیا کہ اس کسان کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس خاندان کا ہے۔ کسان بڑا جابر تھا اس کے کئی بیٹے تھے۔ جو جیکسن کو طرح طرح سے زک پہنچایا کرتے تھے۔ روز پٹائی ہوتی تھی۔ مگر کھانے کو اچھا ملتا تھا۔ اس نے بارہ تیرہ برس کی عمر سے بھاگنے کی کوشش شروع کی۔ تین چار سال کی مستقل کوششوں کے بعد وہ لڑھکتا پڑھکتا دھکے کھاتا لندن پہنچا۔ وہاں اس نے دُنیا بھر کے پیشے باری باری اختیار کئے مگر اس عرصہ میں وہ اِتنا ڈھیٹ، مکّار اور خودسر ہو گیا تھا کہ دو دن سے زیادہ کوئی نوکری نہ رہتی۔

وہ شکل وصورت کا وجیہہ تھا اس لئے لڑکیوں میں کافی ہر دلعزیز تھا ڈارتھی اس کی بیوی بڑے ناک چڑھے خاندان کی لڑکی تھی۔ کم رُو اور کم ظرف بھی تھی۔ اس کا باپ بارسوخ آدمی تھا۔ جیکسن نے سوچا اس خانہ بدوشی کی زندگی میں بڑے جھنجھٹ ہیں۔ آئے دن پولیس اور کچہری سے واسطہ پڑتا ہے کیوں نہ ڈارتھی سے شادی کر کے عاقبت سنوار لی جائے۔

ڈارتھی اس کے باس کی بیٹی اس کی دسترس سے باہر تھی۔ وہ اُونچی سوسائٹی

میں اٹھنے بیٹھنے کی عادی تھی۔ مگر جیکسن کی اس وقت دونوں آنکھیں اصلی تھیں یہ تو جب ڈارتھی سے لڑ کر وہ شرابخانوں کا ہو رہا، وہاں کسی سے مار پیٹ کرنے میں آنکھ جاتی رہی۔ جب تک اس کی صرف بڑی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

"ہاں تو تم نے ڈارتھی کو کیسے گھیر کر پھانسا۔۔۔؟" میں نے اور کریدا۔

"جب میری دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔" جیکسن مسکرایا۔

کسی نہ کسی طرح ڈارتھی مینتھے چڑھ گئی۔ کم بخت کنواری بھی نہیں تھی۔ مگر ایسے فیل مچائے کہ باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔ وہ شاید اپنی شادی سے نا امید ہو چکی تھی اور خود اس کی گھات میں تھی۔

باپ نے بھی لڑکی کی مجبوریوں کو سمجھ لیا۔ نیز بیوی کے روز روز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے ہندوستان بھجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر نکما انگریز ہندوستان کے سر منڈھ دیا جاتا تھا۔ خواہ وہ وہاں جوتے گانٹھتا ہو۔ یہاں آتے ہی صاحب بن بیٹھتا تھا۔

جیکسن نے حد کر دی۔ وہ ہندوستان میں بھی ویسا ہی نکما اور لاابالی ثابت ہوا۔ سب سے بڑی خرابی جو اس میں تھی وہ اس کا چھچھوراپن تھا۔ وہ بجائے صاحب بہادروں کی طرح رعب داب سے رہنے کے وہ نہایت بھونڈے پن سے نیٹو لوگوں میں گھل مل جاتا تھا۔ جب وہ بستی کے علاقے میں جنگلات کے محکمہ میں تعینات ہوا تو وہ کلب کے بجائے نہ جانے کن چنڈو خانوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ آس پاس صرف چند انگریزوں کے بنگلے تھے۔ بدقسمتی سے زیادہ تر لوگ معمر اور بردبار

تھے۔ سنسان کلب ہیں جہاں ہندوستانیوں اور کتوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔
زیادہ تر اگو بولا کرتا تھا۔ سب ہی افسروں کی بیویاں اپنے وطن میں رہتی تھیں۔
جب کبھی کسی افسر کی بیوی ہندوستان آتی تو وہ اسے بجائے جنگل میں لانے
کے خود چھٹی لے کر شملہ یا نینی تال چلا جاتا۔ پھر بیوی ہندوستان کی غلاظت سے
عاجز آ کر واپس چلی جاتی اور اس کا صاحب ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ بیوی کی حسین
یاد لیئے لوٹ آتا۔ صاحب لوگ ویسے اپنا کام نیٹو عورتوں سے چلا لیا
کرتے تھے۔ اس قسم کے تعلقات سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ حساب
بھی سمتا رہتا تھا ہندوستان کا بھی فائدہ تھا اس میں ایک تو ان سے
پیدا ہونے والی اولاد یا دامی اور کبھی خاصی گوری بھی ہوا کرتی تھی دوسرے
یہ اولاد باقی نیٹو لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتی تھی کیونکہ ان کے
بارسوخ باپ ان کے لئے یتیم خانے اور اسکول بھی کھول دیتے تھے سرکاری
خرچہ پر ان کی دوسرے ہندوستانیوں سے بہتر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ
اینگلو انڈین خوش شکل طبقہ انگریزوں سے بس دوسرے نمبر پہ تھا۔ لڑکے
ریلوے، جنگلات اور نیوی میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے جو معمولی
شکل کی لڑکیاں ہوتیں انہیں ہندوستانی لڑکیوں کے مقابلے میں بہتر نوکریاں مل
جاتیں اور وہ اسکولوں، دفتروں اور ہسپتالوں کی رونق بڑھاتیں۔ جو زیادہ
حسین ہوتیں وہ بڑے بڑے شہروں کے مغرب زدہ بازارِ حسن میں بڑی کامیاب
ثابت ہوتی تھیں۔

جیکسن صاحب جب ہندوستان آیا تو اس لمبے کالے شخص کے نام عجب بڑی

افراط سے موجود تھے۔ بشر اس کی عادتِ ثانی بن چکی تھی۔ ہر جگہ اس کی کسی نہ کسی سے ٹھنی چلی جاتی اور اس کا تبادلہ ہو جاتا۔ جنگلات سے ہٹا کر اسے پولیس میں بھیج دیا گیا۔ جس کا اسے بہت ملال تھا۔ کیونکہ وہاں ایک پہاڑن پر اس طرح دل آ گیا تھا۔ جبل پور پہنچ کر وہ اسے ضرور بلوا لیتا۔ مگر وہاں اسے ایک نٹنی سے عشق ہو گیا۔ ایسا شدید عشق کہ اس کی بیوی ساری چھٹیاں نینی تال میں گزار کر واپس چلی گئی اور وہ نہ گیا۔ کام کی زیادتی کا بہانہ کرتا رہا چھٹی نہ ملنے کا عذر کیا۔ مگر ڈارلنگ کے ڈیڈی کے کتنے ہی دوست تھے جن کے رسوخ کی وجہ سے اسے زبردستی چھٹی دلوائی گئی۔ جب وہ نینی تال پہنچا تو اس کا وہاں قطعی دل نہ لگا۔ ایک تو ڈارلنگ اس کی جدائی میں اس پر سے طرح عاشق ہو گئی تھی۔ اور چاہتی تھی دوبارہ ہنی مون منایا جائے۔ دوسری طرف جیکسن کے طریقہ عشق سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ وہ اتنے دن ہندوستان میں رہ کر بالکل ہی اجنبی ہو چکا تھا۔ پہاڑن اور نٹنی دونوں نے اس کی ہندوستانی پتی دیوتا استریوں کی طرح خدمت کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ سال میں صرف دو مہینہ کے لیئے آنے والی بیوی بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے سامنے جیکسن کو تکلفات برتنا پڑتے تھے۔ ایک دن نشہ میں اس نے کچھ پہاڑن اور نٹنی کے اندازِ محبت کا اپنی بیوی سے مطالبہ کر دیا۔ وہ ایسی چراغ پا ہوئی کہ جیکسن کے کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے بہت جرح کی۔ بہت کریدا کہ ”کہیں تم بھی دوسرے بے غیرت اور نیچ انگریزوں کی طرح لوکل عورتوں سے میل جول تو نہیں بڑھانے لگے ہو۔“ جیکسن نے قسمیں کھائیں اور ڈارلنگ کے اتنے پیار لئے کہ وہ اس کی

پارسائی کی قائل ہوگئی۔ اسے بڑا نمس آیا اور بڑے اصرار سے وہ اسے جبل پور لے آیا۔ مگر وہ وہاں کھیوں اور گرمی سے بوکھلا کر نیم پاگل ہوگئی اور تو سب جھیل جاتی مگر جب اس کے غسل خانے میں دو موئی نکلی تو وہ اسی وقت سامان باندھنے لگی۔ جیکسن نے بہت سمجھایا کہ یہ سانپ نہیں اور کاٹتا بھی نہیں مگر اس نے ایک نہیں سُنا اور دوسرے دن دہلی چلی گئی۔

وہاں سے اُس نے زور لگا کر اس کا تبادلہ بمبئی کا کروا دیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی ملٹی کی جُدائی اور ڈارتھی کا بمبئی میں مُستقل قیام سوہانِ روح بن گیا سکھو بائی بچوں کی آیا کا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھی گئی تھی۔ مگر پارش سے جی چھوڑ کر ڈارتھی مع بچوں کے وطن گئی تو جیکسن کی نظرِ عنایت اُس پر پڑی۔ اُف کس قدر اُلجھی ہوئی داستان تھی صاحب کی کیونکہ سکھو بائی اصل میں گنپت ہیڈ بیرے کی رکھیلی عورت تھی۔ وہ اسے پونا پل سے پھسلا لایا تھا۔ ویسے بیوی بچوں والا آدمی تھا۔ بوجھ سے بچنے کے لئے اسے بطور کمائی کے بچوں کی آیا کے نیچے رکھوا دیا تھا۔ سکھو بائی اپنی اس نوکری سے جس میں زمین پوچھنے، برتن دھونے کے علاوہ گنپت کے ناز اٹھانا بھی شامل تھا، کافی مطمئن تھی۔

گنپت اسے کبھی اپنے کسی دوست کو بھی از راہِ کرم یا قرضہ کے عوض میں دیدیا کرتا تھا۔ مگر بڑی چالاکی سے کہ بہت دن تک سکھو بائی کو پتہ بھی نہ چلا وہ پینے سے تو پہلے ہی کچھ واقف تھی۔ گنپت کی صحبت میں پابندی سے شام کو ٹھرا چڑھانے لگی۔ گنپت گاہک کو اپنی کوٹھڑی میں لے آتا۔ جیکسن گاڈر تو کسی کو

تھا نہیں۔ سب کام کاج چھوڑ کر نوکر مزے سے جوا کھیلتے۔ ٹھرا پیتے بلکہ سارے شیواجی پارک کے غنڈے آرتی کے جاتے ہی صاحب کے بنگلے پر ٹوٹ پڑتے اور رات گئے تک ہلڑ مچا رہتا۔

شراب جب خوب چڑھ جاتی تو وہ سکھو بائی کو اس آدمی کے پاس چھوڑ کر کسی بہانے سے چلا جاتا۔ سکھو بائی سمجھتی وہ گنپت کو اُلّو بنا رہی ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ صاحب کی خدمت کرنے کرتے بیوی کی عبوضی بھی بھگتنے لگی۔ اس طرح گنپت کے چکمہ سے چھٹی ملی۔ وہ کم بخت اُلٹا اس کی ساری تنخواہ اینٹھ لیا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں گنپت فوج میں بیرے کی حیثیت سے مڈل ایسٹ چلا گیا اور سکھو بائی مستقل میم صاحب کی جگہ جم گئی۔ بس جب چھٹیوں میں میم صاحب آتیں تو وہ اپنی کھولی میں منتقل ہو جاتی۔ اور جب وہ اپنی پتلی کوک دار آواز میں۔

"آیو۔ دردے" پکارتیں تو وہ فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کے

"یس میم صاب!" کہہ کر لپکتی۔ یوں تو میم صاب سکھو کر وہ اپنے آپ کو بڑی انگریزی دان سمجھنے لگی تھی - - - - - - - - انگریزی زبان میں یس نو ڈیم فول۔ سو آیئن کے سوا اور ہے ہی کیا؟ حاکموں کا ان چند الفاظ میں ہی کام نکل جاتا ہے۔ چوڑے ادبی جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تانگہ کے گھوڑے کو ٹخ ٹخ اور چابک کی زبان ہی کافی ہوتی ہے۔ مگر سکھو بائی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریز کی گاڑی میں جتا ہوا مریل گھوڑا الف ہو کر گاڑی لوٹ چکا تھا اور اب اس کی لگامیں دوسرے ہاتھوں میں تھیں۔ اس کی دُنیا بڑی محدود تھی۔ وہ خود اس کے دو بچے اور اس کا "مرد"!

جب میم صاحبہ ہندوستان آیا کرتی تھی۔ جب بھی سکھو بائی بڑی فراخ دلی سے عیوضی چھوڑ کر پھر نینی کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے لگتی۔ اسے میم صاحب سے قطعی کوئی حسد نہیں تھا۔ میم صاحب مغربی حسن کا نمونہ ہو تو ہو۔ ہندوستانی معیارِ حسن کے ترازو میں اسے تولا جاتا تو جواب صفر ملتا۔ اس کی جلد کھرچے ہوئے شلغم کی طرح کچی کچی تھی۔ جیسے اُسے پوری طرح پکنے سے پہلے ڈال سے توڑ لیا گیا ہو۔ یا ٹھنڈی بے جان اندھیری قبر میں برسوں دفن رکھنے کے بعد نکالا گیا ہو۔ اس کے چھدرے میلی چاندی کے رنگ کے بال بالکل بڑھیوں کے بالوں کی طرح لگتے تھے۔ اس لئے سکھو بائی کے درجے کے لوگ اسے بڑھیا سمجھتے تھے۔ یا پھر سورج مکھی جسے ہندوستان میں بڑا قابلِ رحم سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ منہ دھوئے ہوتی تو اُس کی پنسل سے بنائی ہوئی بھوویں غائب ہوتیں۔ چہرہ ایسا معلوم ہوتا گویا کسی نے تصویر کو سینے ربڑ سے بگاڑ دیا ہو۔

پھر ڈارتھی سردتھی، اجنبی تھی۔ جیکیسن کا وجود اس کے لئے ایک گھناؤنی گالی تھا۔ وہ اپنے کو نہایت بدنصیب اور مظلوم سمجھتی تھی۔ اور شادی کو ناکامیاب بنانے میں وہ حق بجانب تھی۔ خواہ جیکیسن کتنے ہی بلند عہدے پر پہنچ جاتا وہ اس پر فخر نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ یہ سارے عہدے خود ڈارتھی کے باپ کے دلائے ہوئے ہیں۔ جو کسی بھی احمق کو دلا دیئے جاتے تو وہ آسمانوں کو چھو لیتا۔

اس کے برخلاف سکھو بائی اپنی تھی ـــ گرما گرم تھی۔ اس نے پورن پُپ پر الاؤ کی طرح بھڑک کر ہزاروں کے ہاتھ تاپنے کا سامان مہیا کیا تھا۔ وہ گنپت

کی رکھیلی تھی جو اسے اپنی پرانی قمیص کی طرح دوستوں کو ادھار دیا کرتا تھا اس کے لئے جیکسن صاحب دیوتا تھا۔ شرافت کا اوتار تھا۔ اس کے اور گنپت کے پیار کے طریقہ میں کتنا فرق تھا! گنپت تو اسے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے چبا چبا کر تھوکتا۔ اور صاحب ایک مجبور ضرورت مند کی طرح اسے امرت سمجھتا تھا۔ اس کے پیار میں ایک بچے جیسی لاچاری تھی۔

جب انگریز اپنا ٹاٹ پلان لے کر چلے گئے۔ تب وہ نہیں گیا۔ ڈارتھی نے اسے بلانے کے سارے جتن کر ڈالے۔ دھمکیاں دیں مگر اس نے استعفیٰ دیدیا اور نہیں گیا

"صاب تمہیں اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے؟" میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔

"بہت یاد آتے ہیں۔ فلو شام کو دبے سے آتی ہے اور پٹو لونڈوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا ہے میں چاہتا ہوں وہ کبھی میرے پاس بھی بیٹھیں وہ اٹن گھائیاں بتانے لگا۔

"پٹو اور فلو بنیا نہیں الستھرا درکنا ——" میں نے بھی ڈھٹائی لادی۔

"نہیں —— نہیں ——" وہ ہنس کر سر ہلانے لگا۔ "بچے صرف کتیا سے مانوس ہوتے ہیں۔ اُس کتے کو نہیں پہچانتے جو ان کے وجود میں ساجھے دار ہوتا ہے۔" اُس نے اپنی اصلی آنکھ مار کر کہا۔

"یہ جاتا کیوں نہیں یہاں پڑا سٹر رہا ہے۔" یہ میں ہی نہیں آس پاس کے سب لوگوں کو بے چینی ہوتی تھی۔

"جاسوس ہے، اسے جان بوجھ کر یہاں رکھا گیا ہے۔ تاکہ یہ ملک میں دوبارہ برطانوی راج کو لانے میں مدد دے۔" کچھ لوگ یوں بھی سوچنے۔ گلی کے لونڈے

جب وہ دکھائی دیتا یہی پوچھتے۔

"صاب ولایت کب جائے گا؟"

"صاب کوئٹ انڈیا کا ہے کو نہیں کرتا؟"

"ہندوستان چھوڑ دو صاب!"

"انگریزی چھورا چلا گیا—"

"وہ گورا گورا چلا گیا—"

"پھر تم کاہے کو نہیں جاتا؟" سڑک پر آوارہ گھومنے والے لونڈے اس کے پیچھے دھیری لگانے آوازے کستے۔

"ہوں — ہوہوں — جائے گا — جائینگا بابا!" وہ سر ہلا کر مسکراتا اور اپنی کھولی میں چلا جاتا۔

تب مجھے اس کے اوپر بڑا ترس آتا۔ کہاں ہیں دُنیا کے رکھوالے، جو ہر کمزور ملک کو تہذیب سکھاتے پھرتے ہیں۔ ننگوں کو پتلون اور فراکیں پہناتے پھرتے ہیں۔ اپنے سفید خون کی برتری کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ ان کا ہی خون ہے جو جیکسن کے روپ میں کتنا ننگا ہو چکا ہے۔ مگر اسے کوئی مشنری ڈھانکنے نہیں آتا۔

اور جب گلی کے منگتے تھک ہار کر چلے جاتے تو وہ اپنی کھولی کے سامنے بیٹھ کر بیڑی پیا کرتا۔ اس کی اکلوتی اصلی آنکھ دور اُفق پر اس ملک کی سرحدوں کو تلاش کرتی جہاں نہ کوئی گورا ہے نہ کالا۔ نہ کوئی زبردستی جا سکتا ہے نہ آسکتا ہے۔ اور نہ وہاں بدکار مائیں اپنے ناجائز بچوں کو تیری میری

پھر کھٹ پر جن کر خود اپنی با وقار دنیا بسا لیتی ہیں ۔

سکھو بائی آس پاس کے گھروں میں کمائین کا کام کرتی ــــ اچھا خاصا کما لیتی ۔ اس کے علاوہ وہ بانس کی ڈلیاں ۔ میز کرسی وغیرہ بنا لیتی تھی ، اس ذریعہ سے کچھ آمدنی ہو جاتی ـــ جیکسن بھی اگر نشے میں نہ ہوتا تو الٹی سیدھی بے پیندے کی ٹوکریاں بنایا کرتا ۔ شام کو سکھو بائی اس کے لئے ایک ٹھرے کا ادھا لا دیتی جو وہ فوراً چڑھا جاتا اور پھر اس سے لڑنے لگتا ۔ ایک رات اس نے نہ جانے کہاں سے ٹھرے کی پوری بوتل حاصل کر لی اور ساری رات پیتا رہا ــــ صبحدم وہیں کھولی کے آگے پڑ کر سو گیا ۔ فلومنیا اور پٹو اس کے اوپر سے پھلانگ کر اسکول چلے گئے ۔ سکھو بائی بھی تھوڑی دیر اسے گالیاں دے کر چلی گئی ۔ دوپہر تک وہ وہیں پڑا رہا ـــ شام کو جب بچے آئے تو وہ دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا ۔ اسے شدید بخار تھا جو دوسرے دن بڑھ کر سرسام کی صورت اختیار کر گیا ۔ ساری رات وہ نہ جانے کیا بڑاتا رہا ۔ نہ کسے کسے یاد کرتا رہا ۔ شاید اپنی ماں کو جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا جو شاید اس وقت کسی شاندار ضیافت میں شریک " اخلاقی اصلاح بندی " پر تبصرہ کر رہی ہو گی ۔ یا وہ باپ یاد آ رہا ہو جس نے نسل چلانے والے سانڈ کی خدمات ادا کرنے کے بعد اسے اپنے جسم سے بہی ہوئی غلاظت سے زیادہ اہمیت نہ دی ـــ اور جو اس وقت کسی دوسرے محکوم ملک میں بیٹھا قومی اقتدار قائم رکھنے کے منصوبے بنا رہا ہو گا ۔

باڈارنٹی کے طعنوں بھرے احسان یاد آ رہے تھے ۔ جیسے رحم کسان کے

منٹروں کی طرح ساری عمر اس کے احساسات پر برستے رہے یا شاید وہ گولیاں جو اس کی مشین گن سے نکل کر بے گناہوں کے سینوں کے پار ہوئیں اور آج پلٹ کر اسی کی روح کو ڈس رہی تھیں —— وہ رات بھر چلاّتا رہا سر پٹختا رہا —۔ سینے کی دھونکنی چلتی رہی — در و دیوار نے پکار پکار کر کہا —

"تیرا کوئی ملک نہیں — کوئی نسل نہیں — کوئی رنگ نہیں"

تیرا نسل اور ملک سکھو بائی ہے ۔جس نے تجھے بے پناہ پیار دیا — کیونکہ وہ بھی تو اپنے دیس میں غریب الوطن ہے —— بالکل تیری طرح ۔ ان کروڑوں انسانوں کی طرح جو دنیا کے ہر کونے میں پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ان کی ولادت پر شادیانے بجتے ہیں — نہ موت پر ماتم ہوتے ہیں !

پو پھٹ رہی تھی —— ملوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں اور مزدوروں کی قطاروں کو نگل رہی تھیں ۔ تھکی ہاری رنڈیاں اپنے رات بھر کے خریداروں کے چنگل سے پنڈا چھڑا کر انہیں رخصت کر رہی تھیں ۔

"ہندوستان چھوڑ دو —"

"کوئٹ انڈیا ——"

اور جیکسن صاحب نے ہندوستان ہی نہیں دنیا چھوڑ دی ۔

چابڑے

کتنی بار قلم اٹھاتی ہوں اور رکھ دیتی ہوں - اس سے زیادہ نہیں
لکھ پاتی کہ چابڑے کو اصل میں چچا بڑے کہنا چاہیئے تھا مگر لوگ جلدی
میں انہیں چابڑے ہی کہتے تھے - ان کا اصل نام تو تمیز الدین ، یا
امتیاز الدین یا ممتاز الدین تھا - غرض "الدین" ضرور لگا ہوا تھا - حالانکہ
دین دھرم سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا - نماز بھی وہ کبھی بھولے
بھٹکے ہی سے پڑھ لیتے تھے - روزے جوانی میں جوانی کی وجہ سے ، اور
بڑھاپے میں دمہ کی وجہ سے رکھ ہی نہ سکے - ان کو ہاتھ لگانے سے بھی
مجبور تھے - کیونکہ دمہ کے ساتھ مثانہ کی کمزوری کی بھی شکایت تھی اس
لئے وضو ٹوٹ جایا کرتا تھا - اور سینکڑوں لتوں کے ساتھ عورتوں کی
لت بھی لگی ہوئی تھی - لہذا ہزاروں کمانے کے باوجود حج کو جانے کی

توفیق نہ ہوئی ـــــ

شاید کبھی "چابڑے تندرست" بھی ہوں گے، مگر میں نے تو انہیں ہمیشہ چھینکتے، کھانستے، بڑی ہڑکھاتے دیکھا اور چوبیس گھنٹوں میں سے چودہ گھنٹے موری پر بیٹھے دیکھا۔ جب وہ چلتے تھے تو ان کے پیچھے مکھیوں کا ایک جلوس چلتا تھا اور فضا سڑی ہوئی مچھلیوں کی بدبو سے بوجھل ہو جاتی تھی جدھر بھینس، گھوڑا اور مرغیاں رہتی ہیں اُدھر ہماری شاندار کوٹھی کے غیر ضروری کونے میں چابڑے کی کوٹھڑی تھی۔ پاس ہی کالی کیچڑ سے بھری ایک موری تھی جو نوکروں کے پاخانہ سے گزر کر پیچھے کھیتوں میں رستی تھی۔ نہ جانے چابڑے کے جسم سے کونسا تیزاب نکلتا تھا۔ کہ جہاں سے وہ موری کالی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس پاس کی ساری ہریالی جل جاتی تھی ـــــ

مگر سب سے زیادہ شرم کی جو بات تھی وہ یہ کہ چابڑے ہمارے بہت ہی قریب کے رشتے دار تھے۔ ان سے خون کا رشتہ تھا۔ حالانکہ خون کا رشتہ اب باقی نہیں رہنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ بزرگوں کا سارا خون کالی کیچڑ بن کر موری میں بہہ چکا تھا ـــ لہذا یہ خونی رشتہ سراسر بہتان رہ گیا۔

مگر کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں چابڑے کو عشق بھی ہوا تھا۔ عمدہ خالہ ان کی چچا زاد بہن بچپن سے اپنے پھپھیرے بھائی کو منگی ہوئی تھیں۔ ان دنوں منگنی، نکاح کا درجہ رکھتی تھی ایک دن چچا بڑے نے کنکیا اڑاتے وقت ممٹی پر سے عمدہ خالہ کو دھوپ میں پلنگڑی کی آڑ میں نہاتے دیکھ لیا پلنگڑی

کچھ ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ عمدہ خالہ کے دودھ جیسے پنڈے کو صرف بان کے جال کا عکس ڈھانکے ہوئے تھا۔ چابڑے کی کنکیا کٹ گئی۔ ڈور لٹ گئی اور وہ بے سدھ دودھ پر تیرتے ہوئے سرمئی جال میں الجھے غوطے کھاتے رہے۔ عمدہ خالہ جل مچھلی کی طرح اس جال میں مچلتی رہیں۔

اس وقت عمدہ خالہ کی عمر دس یا گیارہ برس تھی۔ کیا زمانہ لوٹ گیا ہے آج کل کی گیارہ برس کی لونڈیاں جانگیے پہنے لڈکڈے لگاتی پھرتی ہیں۔ کوئی ان کی طرف پھر کے بھی نہیں دیکھتا، عشق تو بڑی بات ہے۔

چابڑے نے سر پٹخ دیا مگر عمدہ خالہ کے باوانے ان کی ایک نہ سنی اور عمدہ خالہ بیاہ کر اپنی پھوپھی کے ہاں چلی گئیں بس جانو اسی دن سے چابڑے کا بھیجہ لوٹ گیا۔

قاعدے سے کہانی یہاں آکر ختم ہو جاتی ہے اور میرا قلم ٹھوکر کھا کر سستانے کو رک جاتا ہے آگے لکھنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ چابڑے نے نہایت غیر شاعرانہ حرکتیں کیں۔ نہ تو انہوں نے دشت پیمائی کی اور نہ سر میں تیشہ مار کر جان دی اگر وہ بھی رانجھا۔ مہینوال یا پنول ہی بن جاتے تو آج ان کی بھی امر کہانیاں لکھی جاتیں جس کی فلمیں بنتیں اور تب مجھے اتنی دقت ان پر قلم اٹھاتے وقت نہ پڑتی جتنی اب پڑ رہی ہے۔

دو چار دن منہ اوندھائے پڑے رہنے کے بعد انہیں عشق کی گرد جھاڑ کر اٹھنا ہی پڑا۔ کیونکہ دادا ابا نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر وہ مجنوں بننے کا پروگرام رکھتے ہیں تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سارا عشق ناک کے رستے نکل جائیگا وہ مثل مشہور ہے کہ مار سے بھوت بھاگتا ہے تو پھر بھلا حضرت عشق کی کیا

مجال تھی جو دادا ابا کے نعل دار جوتے کے آگے کچھ نخرا دکھاتے۔ چابڑے کو انہوں نے اپنے ایک پہلوان دوست کو سونپ دیا اور سمجھا دیا کہ ایسے گھسے دو کہ سارا زنگ اتر جائے۔

زنگ اتر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چابڑے چھ فٹے پہلوان بن گئے جب وہ محلے میں انگڑائی لیتے تو لوگ اپنی کنواری بیٹیوں کو کوٹھڑیوں میں بند کر کے تالہ لگا لیتے۔ شہر میں کوئی دنگہ فساد ہوتا، جرم میں چابڑے کا ہاتھ ہوتا۔ رنڈیوں کے کوٹھے تو اسٹیشن تھے۔ جہاں وہ دم بھر کو رکتے اور آگے بڑھ جاتے ان کا ذریعہ آمدنی کیا تھا کسی کو نہیں معلوم تھا مگر وہ ہمیشہ چالیس ہزار کے لٹھے کا گھٹنا اور باریک سے باریک ولایتی تنزیب کا کرتہ پہنے جگر مگر کرتی کامدار جوتی مگر سر پر بجائے ٹوپی کے شکاری ہیٹ پہنتے۔ سفید براق کپڑوں میں ان کا سیاہ جسم آبنوس کی طرح چمکا کرتا۔ ان کی رنگت میں سیاہی اور کچھ سبزی مائل نیلاہٹ جھلکتی تھی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ جلد کے رنگ سے ایک رنگ زیادہ گہری مونچھیں اور بال۔ دبنگ آواز جیسے نرخرے میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہو۔ دل پر زخم کھا کر چابڑے بھری بندوق بن گئے۔

"شادی ہو جائیگی تو سنبھل جائیگا" دادی بی کہتیں اور وہ رنگ برنگی لڑکیوں کے نقشے انہیں لبھانے کو ان کے سامنے کھینچا کرتیں مگر چابڑے وہی ایک بات کہتے "شادی تو ہو سکتی ہے اماں جی!"

"کس سے کرنا ہے مجھے بتا تو سہی" وہ شوق سے پوچھتیں۔

"عمدہ خانم سے۔"

اور دادی بی سر پیٹ لیتیں۔ "ہئے جوانی مرگ بیاہی عورت داغ لگاتا ہے تیری زبان کو لگے آگ ۔"

"تو بیوہ ہو سکتی ہیں عمدہ خانم" چابڑے کی کالی کالی موچھوں میں سفید دانت چمکتے اور دادی بی لرز اٹھتیں۔ چابڑے کا کیا بھروسہ، ایک دن ایک رنڈی ان سے روٹھ گئی۔ یہ گئے تو ان کی طرف سے منہ پھیر کر اپنے نئے گاہک سے لاڈ کرنے لگی۔ چابڑے نے چوٹی پکڑ کر اسے اپنی طرف موڑ لیا۔ گاہک بھی الجھ پڑا۔ چابڑے نے اٹھا کر اسے دومنزلے سے نیچے پھینک دیا۔ رنڈی نے پولس کو کھلا پلا کر بات دبا دی، چابڑے کو بھی معافی دے دی مگر چابڑے نے اسے موٹی سی گالی دی پھر بہت پچھتائے کہ خواہ مخواہ بے چاری گالی کی ذلت ہو گئی۔

چابڑے زیادہ گھر سے باہر رہنے لگے۔ پھر شہر سے باہر رہنے لگے کبھی سال دو سال میں آجاتے، تین چار یار دوست اور خوشامدی ساتھ چپکے ہوتے۔ ڈھیروں روپیہ لاتے۔ سارے محلے کے لونڈے جمع کر کے کبڈی گلی ڈنڈا اور دنگل جمائے جاتے۔ دادی بی کے لکڑی کے صندوق روپیہ جمع کرا دیتے۔ صبح مٹھی بھر روپے لے کر اس کے پیسے بھنا لیتے اور خود مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے اور لونڈوں کا جم غفیر انہیں گھیر لیتا۔ فی پیسہ ایک چپت کے حساب سے بھاؤ کر کے دام چکا دیئے جاتے۔ جب مارتے مارتے ہاتھ شل ہو جاتے تو یار دوستوں کو چپتیں خرید کر تقسیم کر دی جاتیں۔ اب بھی روپے بچ جاتے تو موسم کا پھل یا مٹھائی منگا کر بانٹ دی جاتی جو کم پڑ جاتے تو کاٹھ کے صندوق سے دوسری مٹھی نکل آتی۔

اور جب کبھی عمدہ خانم کا نام آتا چچا دادی بی سے کہتے "عمدہ خانم سے کہو اس نامراد کو چھوڑ دو۔ ورنہ کسی دن داؤں لگ گیا تو عمدہ خانم کو بھی پار کر دوں گا ____"

اور دادی بھی جوتی لے کر چچا بڑے پر ٹوٹ پڑتیں " اے تجھے ہیضہ ہو تجھے ڈھائی گھڑی کی سمیٹے، بال بچوں والی کو داغ لگاتا ہے۔"

اور چچا ہنستے ہوئے مٹھی بھر روپیہ لے کر بھاگ جاتے۔ جب پیسے ختم ہو جاتے تو ایک دم چچا بڑے غائب ہو جاتے۔ دادی بی ان کے پیسے کو ہاتھ لگانا حرام سمجھتی تھیں۔ فقیر کو دینے بھی کراہت محسوس کرتیں۔ جسم کے کپڑوں کے علاوہ وہ کچھ ساتھ نہ لے جاتے۔ ان کے جانے کے بعد دادی بی ان کے کپڑے اور بستر لپیٹ کر خیرات خانہ بھجوا دیتیں ___

چچا بڑے کو مستقل قسم کی چیزوں سے بڑی نفرت تھی۔ ایک دفعہ جو آئے تو ایک میلی کچیلی گنواری کو بھی ساتھ لے آئے، کسی کو کچھ اس کے رشتہ کا پتہ نہ تھا، ہاں وہ رات کو ان کے پاؤں دبانی تھی۔ معلوم ہوا دھوبی کی عورت بدھیا کو بھگا لائے ہیں۔ دادی بی نے ماتھا کوٹ لیا ___

"نکال دو نسالی کو" چچا بڑے لاپرواہی سے بولے۔

مگر اس نے واویلا مچائی کہ توبہ بھلی۔ اس کا میاں بھی ایک آدھ دفعہ آیا کہنے لگا " اب میرے کام کی نہیں رہی" اور کچھ روپے لے کر چلا گیا اس کا ایک لڑکا بھی تھا۔ جسے چچا بڑے کبھی ساتھ لئے چلے آتے، انگلی

پکڑا کر اسے بازار کرنے لے جاتے، ڈھیر سے کھلونے دلاتے اس کا
خوب لاڈ کرتے پھر نہ ایک دم جی اکتا جاتا تو چپت مار کر بھگا دیتے چابڑے
شراب پیتے تھے اس لئے دادی بی نے ان کا چولہا الگ کر دیا ——
بڑھیا ان کے لئے گوشت بھون کر پراٹھے تلتی اور آدھی رات تک
بھوکی پیاسی ان کا انتظار کرتی اور جب وہ نشے میں چور رنڈی کے کوٹھے
سے لوٹتے تو بھنا گوشت اور پراٹھے کھلا کر ان کے پیر دباتی۔ چابڑے
اس کی خدمت گذاری سے ذرا مرعوب نہ ہوتے اور ذرا سی بات پہ مار
مار کر بھرتہ کر دیتے اور ایک دن وہی ہوا جس کا دادی بی کو ڈر تھا
محرموں کے دن تھے چابڑے سارا دن شراب پی کر ڈھول پیٹتے رہے
اور تعزیئے اُٹھاتے رہے۔ رات کو تھکے ہارے لوٹ رہے تھے کہ انہیں
ناظر رکشا ٹوٹی ہوئی نظر آئی۔ گلی سنسان تھی اور سواری دیوار سے لگی
رکشا کی مرمت کا انتظار کر رہی تھی۔ برقعہ پوش عورت چابڑے کو دیکھ
کر ایک دم دیوار سے چپس کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے" چابڑے نے رکشا والے سے پوچھا ——

"حجور رکشا اُلٹ گئی" رکشا والا چابڑے کو جانتا تھا۔ مگر ان کے
گھونسے کو بھی خوب پہچانتا تھا۔

"ابے یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں"

"حجور مرجا (مرزا) صاحب کے گھر کی سواری ہے۔ اب انہیں
کیسے پہنچاؤں ——"

"کون سے مرزا صاحب"

"حضور مرتجا بیگ"

"ہیں۔۔۔۔۔۔ عمدہ خانم" چچا بڑے نے گھٹے ہوئے گلے سے کہا اور ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ دو چار موٹی موٹی گالیاں رکشا اور اس کے مالک کو دیں اور پھر احمقوں کی طرح سر کھجانے لگے۔ ان کی زبان کو تالا لگ گیا

"حضور دوسرے رکشا آگے نکل گئے، بھیڑ میں پیچھے رہ گیا" چچا بڑے سر کھجاتے اور موبنہ ہی میں گالیاں بکتے رہے۔ سوچنے لگے کہ بھلا اسوقت سواری کہاں ملے گی کہ اتنے میں ایک تانگہ میں دو آدمی جاتے دکھائی دیئے۔ چچا بڑے نے تانگہ رکوا کر ان سے کہا کہ "اُترو" وہ اُترنے لگے تو چچا بڑے نے دونوں کے سر پکڑ کر ٹکرا دیئے اور عمدہ خالہ سے کہا "چلو بیٹھو" عمدہ خالہ بڑی طرح لرزنے لگیں، اگر پاس کوئی کنواں کھائی ہوتی تو جان دے دیتیں، مگر آج تو موذی کے ہاتھوں جان کے لالے پڑ گئے۔ "سیدھی طرح تانگہ میں بیٹھ جاؤ۔ میں کھا نہیں جاؤنگا۔ عمدہ خانم" چچا بڑے گرجے۔ ورد و آیۃ الکرسی پڑھتی خالہ تانگہ میں بیٹھیں۔ چچا ساتھ تانگے کے بم پکڑے چلے۔ جگہ تھی پہ خود نہ بیٹھے تانگہ میں ـــــ

اور سارے راستے ان کے موبنہ کو لگا ہوا تالہ نہ کھلا اور عمدہ خالہ کے برقعے کی نقاب آنسوؤں میں بھیگتی رہی۔ وہ ان کی ساری دھمکیاں سارے ڈراوے ہوا میں تحلیل ہو چکے تھے۔ وہ تانگہ کے ساتھ بھاگ رہے تھے اور آنکھیں نیچی تھیں۔ مکان سے تھوڑی دور ان کے قدم رُک گئے۔ جیب سے دو

روپے نکال کر اُنہوں نے تانگے والے کو دیئے اور جب خالہ اُتر کر ڈیوڑھی میں چلی گئیں تو چابڑے سر جُھکائے اپنے گھر کی جانب چل دیئے
رات کو جب بدھیا نے ان کے پیر دبانے چاہے تو انہوں نے اس کے ایک لات رسید کی اور موہنہ موڑ کر پڑ رہے ____

بدھیا مستقل بِشے بن کر چابڑے کی جان کو چمٹ گئی۔ چابڑے نے دہ وہ اسے چار چوٹ کی مار دی اور نکالنا چاہا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ____

دہ چاہے میری بوٹیاں کاٹ ڈالو مرزا جی اب میں اور کہیں کی تو رہی نہیں، ذات برادری نے باہر کر دیا۔ تم نے میرا خرابا کیا ہے، چھاتی پر چڑھ کے خون پی جاؤں گی، پر اس جنم میں تو نہیں چھوڑونگی"
چابڑے سہم کر چپ ہو گئے ____
بدھیا کی اس دلبری کا ان پر رعب پڑ گیا۔ کچھ عمر کا تقاضہ، کچھ روپیے کی ریل پیل میں کمی، چابڑے اسے جھیل گئے۔ بدھیا ان کی بیوی کی طرح خدمت کرتی۔ پھٹا پرانا پہنتی کبھی اسے خیال بھی نہ آتا گھر کے بوڑھے بچے سب اسے بدھیا کہتے ہیں۔ گھر کی بہو بیٹیوں سے دور وہ ہمیشہ زمین پر بیٹھتی، مگر اس کی خدمت گذاریوں میں کمی نہ آئی۔ چابڑے نے اسے مارنا بھی کم کر دیا۔ کبھی ایک آدھ جھاپڑ دھر دیتے۔ روپیہ پیسہ اسی کے ہاتھ میں رہتا۔ بڑی چھک جھک سے

شام کے نشے کا خرچہ دیتی ۔ چا بڑے بگڑتے، خفا ہوتے، لیکن کچھ کر نہ پاتے ۔ بلکہ اسے زیور بھی بنوا کر دینے شروع کیئے اور زبردستی پہننے کو کہتے ۔ اس کا لڑکا ایک فیکٹری میں نوکر ہو گیا تھا، چا بڑے اسے بہت چاہتے تھے اپنا موروثی مکان اُس کے نام کر دیا تھا اور بالکل بیٹے کی طرح سمجھتے تھے ۔ ایک دن جب بڑے تر نگ میں تھے ۔ بڑھیا نے دہی ڈال کر گوشت بھونا اور گرم گرم پڑا اٹھے اتارے ۔ چا بڑے وہیں چولہے کے پاس بیٹھ کر چٹخارے لے کر کھانے لگے ۔

"بھئی واہ کمال کر دیا بڑھیا آج تو تو نے ۔ بھئی واہ... کیا بوٹی گلائی ہے ۔ تجھے تو انعام ملنا چاہیئے ۔ بول کیا مانگتی ہے"

"جو مانگوں سو دو گے مرزا جی ؟"

"ہاں ہاں ..... وہ تیرے کنگن کل آجائیں گے ۔

"وہ تو بیکار بنوا دیئے ......"

"پھر کیا مانگتی ہے ؟"

"مرزا جی مجھ سے نکاح کر لو" بڑھیا نے لجا کر کہا ۔ "بڑھاپے میں گناہ نہیں کیا جاتا"

"نکاح ! گناہ !"

چا بڑے کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا ۔ نوالہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا، ان کا سیاہ چہرہ تنور کی طرح دمک اُٹھا ۔ چولھے سے لکڑی کھینچ کر اُنہوں نے بڑھیا بیگم کا پلیتھن کر دیا ۔ اگر لوگ باگ بچا نہ لیتے تو شاید

وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتے" گناہ کی بچی . . . . کہتی ہے نکاح کر لو۔ سالی ہماری ہتک کرتی ہے ارے ہم نے اسی کمبخت کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ ہم نے اس کے لڑکے کو اپنا جائز وارث بنایا، فیکٹری میں نوکری دلوائی جو کچھ کمایا اس کی ہتھیلی پر رکھا۔ پھر بھی نکاح کی ضرورت ہے۔؟ ہمارے اوپر اعتبار نہیں نظامہ کو، ہم سے پکے کاغذ لکھوانی ہے"

مرتے مرگئی۔ پھر بدھیا نے نکاح کی تمنا نہ کی۔

وقت کی ندی اچھلتی کودتی بل کھاتی رہی، بہتی رہی۔ بدھیا کے مرنے کے بعد چا بڑے جیسے یتیم ہو گئے۔ کوئی ان کی دیکھ بھال بدھیا کی طرح کیسے کر سکتا۔

ننھے بچے کی طرح آنچل کی چھاؤں میں رکھتی تھی۔ ان کی گت بن گئی۔ اور وہ ایک رشتہ دار کے در سے دوسرے کے در کی ٹھوکریں کھاتے لڑھکتے پڑھکتے ہماری کوٹھی کے سب سے سڑاندے کونے میں پہنچ کر وہیں بس گئے۔

چا بڑے کی زندگی کے آخری دن کتنے ویران اور پیار و محبت سے خالی تھے۔ کئی دن وہ اکیلے کوٹھڑی میں پڑے دم توڑتے رہے۔ کبھی کوئی جھانک آتا۔ کون تھا جو دن رات ان کے سرہانے بیٹھتا۔ پرانی یادوں کے جال میں الجھے چا بڑے تڑپتے رہے۔ تلملاتے رہے۔

"عمدہ خانم سے کہلوا دو اب زیادہ انتظار کی سکت نہیں، اتنا نہ آزماؤ آپ ابھی آجاؤ" حالانکہ عمدہ خالہ ان سے پانچ سال پہلے مر چکی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی دے کر آئے تھے۔

" بدھیا سے کہو یہ سارے دروازے کیوں بند کر دیئے . . . دم گھٹ رہا ہے

" دودھ جیسے پنڈے پر سرمئی جال گھرا ہوتا گیا . . . "

کنگھا کٹ گئی اور بڑی لٹ گئی

______

بھیڑیں

او گاڈ! او مائی گاڈ!

میگی صرف دکھ میں ڈوب کر ہی انگریزی میں خدا کو یاد کرتی تھی۔ اس کا چہرہ ہزار بار دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح ملگجا ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ موت کی سبزی ہونٹوں کو چوس رہی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کی آخری گری میں وہ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جو سوائے پاک مریم کے اور کسی کنواری نے عزدر سے سر اٹھا کر نہیں سہیں وہ ایک غلیظ دری پر پڑی تھی اور سرہانے کی جگہ لکڑی کا وہ پیڑا دھرا تھا۔ جس پر بیٹھ کر سلینا روٹی پکاتی تھی۔ کچن میں باسی کھانے اور جلی ہوئی ہانڈیوں کی بُو بسی ہوئی تھی۔ عین اس کے سر پر سوڈے میں ابالی ہوئی صافیاں سُتلی کی الگنی پر لٹکی سڑاندی بھاپ دے رہی تھیں۔ دری کے کناروں سے لگے لگے کاکروچ کے بچے دوڑ رہے

تھے۔ اور باریک باریک چیونٹیوں کی ڈورا جیسی قطار طشتری میں رکھے ہوئے گلاب جامن کے شیرے کی طرف ڈبل چال لپکی جا رہی تھی۔

"اسے کیا ہوگیا؟" میں نے ڈسٹ بن کے ڈھکنے پر پڑی ہوئی باسی دال سے آنچل بچا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں میم صاحب جکام ہے"۔ سلینا ناک سڑک کر چھا چھ میں بیسن گھولنے لگی۔ مگر میگی نے جس درد بھرے انداز میں سسک کر انگریز خدا کو پکارا وہ زکام کے سر کسی طرح بھی نہیں تھوپا جا سکتا تھا۔

"اسے ہسپتال لے جاؤ۔" میں نے پنڈلی پر چڑھتے ہوئے لال بیگ کو سپاٹا مار کر جھاڑ دیا۔ سلینا سے کچن کا کام بالکل نہیں سنبھلتا۔ اگر اس کے جان نثاروں کی فوج ہر وقت ڈیوٹی پر نہ رہے تو اتنے بڑے فلیٹ کا کام یہ دبلی پتلی ناک سڑکتی لڑکی تیس روپیہ میں نہیں کر سکتی۔ ہم بھی مجبور ہیں اور وہ بھی۔ وہ اس لیے کہ اس کی عمر کی ناتجربہ کار چھوکریاں رُلی رُلی پھرتی ہیں۔ خاص طور پر اس مالدار علاقے میں جہاں ہر گھر میں دو چار نوکر رکھنے کی توفیق ہے جو نسبتاً دوسرے علاقوں سے زیادہ محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ مطلب ہے چھوکریوں کو لفڑے میں پھنسنے کے خطرات کم ہیں۔ نوکر لوگ بھی زیادہ بلکٹ نہیں ہوتے۔ ادھر باندرہ اور سانتا کروز میں تو دن دیہاڑے چھوکری لوگ کو ایک دم خراب کر دیتے ہیں۔

میگی سلینا کی سگے والی ہے۔ دونوں منگلور کے قریب کوئی گاؤں ہے ادھر کی رہنے والی ہیں۔ ایک گاؤں کے باسیوں میں سب ہی ایک دوسرے

کے سگے والے ہوتے ہیں۔ اور پھر سہیلیوں کو دو چار دن مہمان رکھنے کے لئے سگے والا ہی بولنا پڑتا ہے۔ ویسے دونوں ہی نو دس برس کی عمر سے بمبئی تلاش معاش میں آئی ہوئی ہیں۔ اور واپس جانے کے نہ کوئی آثار ہیں اور نہ شوق۔

"ہم لوگ میں بہت چھوکری ہے۔" سیلیتنا نے تشریح کی۔ خدا جانے غریبوں میں چھوکریاں افراط سے کیوں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ بنائی جاتی ہیں۔ مشنری نچلے طبقے میں جب تبلیغ کے لئے جاتے ہیں۔ تو فاقوں کے مارے والدین لڑکوں کو بچا لیتے ہیں صرف لڑکیوں کو ہی یسوع مسیح کی بھیڑوں میں شامل کر دیتے ہیں۔ اس سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو گھر کے کوڑے سے نجات مل جاتی ہے۔ دوسرے عاقبت درست کرنے کی قیمت بھی ملتی ہے اگر کال پڑ جائے۔ تو وہ اور بات ہے۔ مفت ہی لوگ موت کے منہ میں جھونکنے کی بجائے ایمان ہی کے کوڑے کر لیتے ہیں۔ تب تو پانچ پانچ روپیہ میں چھوکری لوگ مل جاتی ہے۔ ورنہ پندرہ بیس اور کبھی پچیس روپیہ تک تو آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے۔

ان بچیوں میں فراکیں بانٹی جاتی ہیں۔ ایلومونیم کی ایک ایک صلیب اور پر یئر بک جب پر ان کے علاقے کے پادری کا پتہ ہوتا ہے پکڑا دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مقامی پادری ان لڑکیوں کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ اور کرسمس ایسٹر اور گڈ فرائی ڈے کے موقع پر تو خاص طور سے چھان بین کرتا ہے۔"

جب یہ نو دس برس کی ہو جاتی ہے۔ اور موٹا جھوٹا چاول متعدد پیٹوں کی آگ بجھانے کے لیے ناکافی ہونے لگتا ہے۔ تو انھیں تلاش روزگار کے سلسلے میں مدراس۔ بمبئی، کلکتہ وغیرہ ہجرت کر کے جانا پڑتا ہے ان شہروں کو جانے والے کسی سگے والے کے ساتھ انھیں رخصت کر دیا جاتا ہے۔ شہر میں پہنچ کر وہاں کے کسی پادری کے توسط سے وہ کسی معتبر معمر آیا کے سپرد ہو جاتی ہیں۔ تاکہ وہ ان کے رہنے بسنے کا کچھ انتظام کر دے۔

ان بچیوں کو سر چھپانے کی جگہ بڑی آسانی سے مل جاتی ہے۔ جوٹھن کھا کر یہ ان آیا کے گھروں میں چھوٹا موٹا کام سیکھنے لگتی ہیں آہستہ آہستہ وہ اپنے رسوخ سے انھیں کسی فلیٹ میں کسی چھوٹے سے کام پر چپکا دیتی ہیں صرف اور روٹی اور پرانے کپڑے کے عوض وہ ایک طرح سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا ابتدائی سبق سیکھتی ہیں۔

میگھی اور سلینا جب کھبپ میں آئی تھیں۔ وہ قحط کی ماری چھ چھ رخ لڑکیوں پر مبنی تھیں۔ ماما نے چلتے وقت چھینٹ کی دو فراکیں، ایک چپل اور ایک پوٹلی میں بھنے ہوئے چاول اور گڑ کی ڈلیاں ساتھ کر دی تھیں۔ اس کے علاوہ میلے رومال میں بندھی ہوئی مومی موتیوں کی ایک کنٹھی ایک اور پلاسٹک کی دو چوڑیاں بھی تھیں۔ کرسمس میں ملا ہوا ایک گلابی ربن۔ کاغذ کی پھٹی ہوئی ٹوپی اور بالوں میں لگانے کے کانٹے بھی تھے بمبئی جانے کی خوشی میں میگی اور سلینا کی نیندیں کئی راتوں سے اڑی ہوئی تھیں۔

آٹھ گھنٹے کا ریل گاڑی کا سفر بھی مزے سے السی کے تیل میں تلے ہوئے ڈوسے کھانے میں کٹ گیا۔

البتہ ریل کے لمبے اور تھکا دینے والے سفر میں چھوکری لوگ نے خوب رونا شروع کیا۔ مگر رونے سے نہ ریل کے پہیوں کا دل پگھلا اور نہ سگے والے کے کان پر جوں رینگی۔

جب یہ سہمی ہوئی بوری بندر پر اتریں تو پھر ماما اور پپا کی یاد نے ستایا رات انہوں نے دھوبی تلاؤ پر کسی مہربان سگے والی کے ہاں گزاری۔ آتے ہی انہیں عارضی طور پر تبرک کی طرح بانٹ لیا گیا۔ مگر میگی اور سلینا اتنا روئیں کہ انہیں ماسی نے اپنی اکاسی میں ساتھ پڑ رہنے کی اجازت دے دی دوسرے دن فادر نے دیول کے رجسٹر میں ان کے نام اور پتے درج کئے اور دعا کے بعد انہیں ان کی گارجین کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ صرف اتفاق کی بات تھی کہ سلینا ماسی کے حصے میں آئی اور میگی اس کی پڑوسن ماما کے ہاتھ لگی اور اس طرح اپنے پیاروں سے کوسوں دور یہ دونوں ایک دوسرے کے سہارے کو غنیمت جان کر ابتدائی ٹریننگ کے مرحلے طے کرنے لگیں۔

دن بھر جٹ کر اپنی محسنہ کے گھر کا کام کرنا۔ چاول ابالنا۔ مچھی یا جھینگے کی کری بنانا۔ فرش کو کٹکا لگانا یعنی گیلے کپڑے سے پونچھنا، سارے کپڑے گھر کے دھونا اور رات کو تھک کر کسی ٹاٹ کے ٹکڑے پر پڑ رہنا مگر سخت پابندی سے ہر اتوار چرچ جانا۔

ماسی کے بچے سب برسرِ روزگار تھے۔ مگر یہ لوگ بوڑھے ماں باپ کو خرچ نہیں دیا کرتے تھے۔ بلکہ ماسی ادھر کپڑے برتن دھو کر خاصا کما لیتی تھی جو ہر ہفتہ اس کا جواری بیٹا آ کر چھین لے جاتا تھا۔ بڑھیا بیٹے کی صورت سے لرزتی تھی۔ بہت حرامی تھا یہ بیٹا۔

مگر ماتا کے مزے تھے۔ ماتا کے معنی ہیں آپا، جو کنواری ہو۔ ہر وہ عورت جو شادی کی عمر کو پھلانگ جائے اور کنواری رہے وہ ماتا کہلاتی ہے۔ ویسے تو ماتا کی جان کو بھی روگ لگے ہوئے تھے مگر اس کی حالت ماسی سے بدرجہا بہتر تھی۔ وہ بڑی شان سے جس کو چاہتی اپنی کمائی میں سے تحفہ تحائف دیتی۔ کسی کی دھونس نہیں تھی۔ مگر ماسی کی کمائی پہلے موسا جی لے مرتے تھے اور بھڑے میں پھونک دیا کرتے تھے۔ پھر بیٹے جوان ہو گئے تو انھوں نے دستِ شفقت پھیرنا شروع کر دیا۔

ماسی کی دونوں لڑکیاں قبول صورت اور محنتی تھیں۔ چھوٹی سی عمر سے دونوں نے اپنی ڈاوری کا پیسہ اکٹھا کر رکھا تھا۔ جسے موسا جی اور بھائی سے بچانا ایک علت تھی۔ مگر لڑکیاں اچھی تھیں۔ کلابہ میں پارسی خاندانوں سے پالا پڑا جو نسبتاً لفڑے باز نہیں ہوتے۔ دونوں کو جلد ہی تین تین ہزار جہیز میں اچھے دوسرے درجے کے نورے مل گئے۔

نورا یعنی دولھا حاصل کرنا ہر میگی اور سلینا کا مقصد زندگی ہوتا ہے ننھی سی عمر سے یہ پیسہ پیسہ جوڑ کر ڈاوری کا روپیہ جمع کرتی ہیں آٹھ دس سال میں جو کچھ جمع ہوتا ہے اس سے ایک نورا حاصل کرتی ہیں تب

ایک دن موسی بننے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ مانا ہی رہ جاتی ہیں۔ جو ساری عمر دوسروں کے بچے پالتی ہیں۔ جب ایک بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو دوسرے پر جٹ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ سارے بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں بھول جاتے ہیں۔ وہ جن کا بچپن ان ماناؤں کے بنا سنسان رہتا جن کی ماؤں کو اتنی فرصت نہ تھی کہ انہیں ممتا دے سکیں کیونکہ وہ اور قیمتی کھلونوں کی طرح ممتا بھی خریدنے کی حیثیت رکھتی تھیں اور مانا جو ممتا کا بیوپار کرتی ہے ایک بیسوا کی طرح تنخواہ کے عوض دل کی ہوک دیتی ہے۔ راتوں کی نیند دیتی ہے مگر سدا بانجھ رہتی ہے۔

شادی کے بعد بھی بہت سی آیا لوگ کو کام کرنا پڑتا ہے۔ بمبئی شہر میں دو تین ہزار کا نورا ایسا کون سا قارون کا خزانہ کما سکتا تھا۔ کھولی کا کرایہ۔ کھانا کپڑا۔ اُسے اپنی ہی میت گھسیٹنی مشکل ہو جاتی ہے اور پھر اب تو کھولی ملنے کا سوال ہی ختم ہو چکا ہے۔ ایک ذرا سی کھولی کی پگڑی دو تو پوری ڈاوری اسی میں بھسم ہو جائے۔ لہذا جونہی کسی نئی نویلی آیا کو نورا مل جاتا ہے وہ ایسے پادری کے سامنے ڈاوری ادا کر کے اس کی فیانسی بن جاتی ہے۔ نورا ڈاوری کا روپیہ خوب مزے سے پھونکتا ہے ٹھاٹ دار ویڈنگ ڈریس بنوانا ہے۔ خوب بھرتے کی دعوت ہوتی ہے۔ ڈانس ہوتا ہے۔ دولھن دولھا کسی فیاض سگے والے کے ہاں ہنی مون مناتے ہیں۔

پھر ڈاوری کا روپیہ چک جاتا ہے۔ سگے والا مروت کی میعاد ختم

ہو جانے کے بعد کھولی خالی کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ دونوں کی نوکریاں
شادی کے ہنگامے میں ضرور خرد برد ہو جاتی ہیں مگر فوراً ہی کہیں نہ کہیں
کام لگ ہی جاتا ہے۔ نورا اپنے سٹاف کی کھولی میں اور نوری کچن میں،
ایک دوسرے کی صحبت کے لئے تڑپا کرتے ہیں۔ کبھی گرمی ہوتی۔ تو
اسٹاف کے نوکر دریا دلی کا ثبوت دینے کے لئے کھولی نورے کو عطا
فرما دیتے ہیں اور نوری چھیچھڑے لے کر میم صاحب کی سنگھار میز سے آرائش
جمالی اڑا کر سولہ سنگھار کرتی ہے۔ اور نورے کی آغوش میں رات گزار لیتی
ہے۔ یا نورا رات گئے ٹھرا چڑھا کر نوری کے کچن یا بالکنی میں داد عیش دینے
آجاتا ہے۔ یوں عمریں گزر جاتی ہیں۔ نورا نوری موسا موسی بن جاتے ہیں اور
اگر کھولی نہ ملی تو کسی سگے ؟ کی کھولی کے فٹ پاتھ پر گھر بسا لیتے ہیں۔

ہر سال ہزاروں جاندار کھیتوں کی بے مروتی سے تنگ آکر، بڑے
شہروں کے فٹ پاتھ سجانے آجاتے ہیں۔ اس افرا تفری میں کوئی بچہ
جنم لینے پر تل جاتا ہے تو نوری کی نوکری کے لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں
سخت جان بچہ ٹکے سیر دائیوں کی بھیانک دواؤں کے باوجود پیدا ہونے
کا فیصلہ کر لیتا ہے تو چند مہینے کے لئے نوری بورائی کتیا کی طرح میری نیری
کھولی کے فٹ پاتھ پر رہتی ہے پھر یا تو وہ اسے اپنی کسی سگے والے کے
ہاتھ گاؤں بھیج دیتی ہے یا تھوڑا سا خرچ دے کر کسی یتیم خانے میں چھوڑ
دیتی ہے۔

ایسے ماں باپ والے بچوں کے یتیم خانے بھی ہیں۔ بمبئی میں دہلی شہر

کی عیاشی کے نتیجے میں نکلا ہوا کوڑا کنواری نتیں بڑے چاؤ سے سمیٹتی ہیں مگر یہ ڈسوریں بھی عام طور پر اٹا اٹ بھرے ملتے ہیں۔ نوکری کے سال کے بارہ مہینے ہیں بہت کم رہتی ہے اس لیئے والدین کے وعدے پر اعتبار کرنا بڑی حماقت ہے۔

کچھ ستم ظریف یہاں بھی چال چلنے سے نہیں چوکتے۔ بچے کو جو والدین کی موجودگی میں ہی یتیم ہو چکا ہوتا ہے۔ یتیم خانے کے گیٹ پر ڈال جاتے ہیں۔ تاکہ حرامی سمجھ کر ہی پل جائے۔ مگر یار لوگ بھی ان ہتھکنڈوں کو خوب تاڑ چکے ہیں۔ والدین کا سراغ پادریوں کے ذریعے آسانی سے لگ جاتا ہے۔ اور فوراً ان کی گردنیں داب لی جاتی ہیں۔

مگر میگی کا نورا تو فرسٹ کلاس ہوٹل میں بیرا تھا۔ دو ڈھائی سو مار لیتا تھا۔ ٹپ وپ ملا کر خاصا ہینڈسم بالکل ایلوس پریسلے کی طرح گٹار بجا کر ٹانگیں پھڑکاتا تھا۔ سینڈی اور سینڈی سن کر ہی تو میگی اس پر لٹو ہو گئی تھی۔ میگی جو کنواری ماما کے زیر سایہ بڑی کامیاب آیا تھی۔ ایک انگریزی بیبی کی آیا کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے کا فخر حاصل کر چکی تھی۔ ہر اتوار بڑی پابندی سے سر پر سیاہ لیس کا دیل اوڑھ کر وہ اپنی ہجولیوں کے ساتھ جاتی۔ جمعہ کے روز کبھی بھول کر بھی میٹ نہیں کھایا۔ وہ بچپن سے کبھی کسی لفڑے میں نہیں پڑی۔ پوری تنخواہ ماما کو تھما دیتی۔ پانچ روپیہ سے شروع کر کے اب پینتالیس روپے تک آ گئی تھی۔ ساری عمر کی کمائی ڈھائی ہزار ایک اچھے خاصے نورے کی قیمت کے لیئے کافی تھے۔ اوپر سے کالونی کے ٹاپس

ایک پنجابی مس صاحب نے اپنی شادی کی خوشی میں بنوا دیئے تھے ایلومونیم کی صلیب کی جگہ گنی گولڈ کی زنجیر اور ننھی سی صلیب تو اس نے دو سال میں ہی بنوا دی تھی۔ پھر مانا کا کوئی آگے نہ پیچھے۔ میگی ہی اس کی سب سے قریب کی سگے والی تھی۔ نورے کی منگنی کی انگوٹھی اور شادی کا سارا خرچ اس کے ذمہ تھا۔

باقاعدہ منگنی سے پہلے اس نے پیٹر کو بائیکلہ "وائی ڈبلیو سی اے" کے ڈانس کے موقع پر دیکھا تھا۔ اس کی گہری سیاہ رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بے انتہا نمکین تھیں۔ جامنی رنگ کے گدرائے ہوئے ہونٹوں پر نارنجی لپ سٹک چھوٹی نکلتی تھی۔ تب ہی چھوکرے نے اس کے قریب سے گزرتے وقت سیان بوجھ کر اس کو کہنی ماری تھی۔ اونچی ایڑی کی سینڈل پر وہ ڈگمگا کر سنبھل گئی تھی۔ اور اس کے گلابی رنگ کا اسکرٹ گلاب کے پھول کی طرح جھوم اٹھا تھا۔

پھر ایک دن وہ سلینا کے ساتھ میٹرو سے تین بجے کا شو دیکھ کر نکل رہی تھی تو پھر پیٹر نے چھیڑ خانی کرنی چاہی تھی۔ تب اس نے بڑی شان سے بائیکلہ برانڈ انگریزی میں اسے خوب لتاڑا تھا۔ مگر سیاہ فام پیٹر کی گنجی آنکھوں میں شرارت کی پریاں ناچ اٹھی تھیں۔ دور بہت دور کہیں اس کے خون میں چند بوندیں ولایتی لہو کی تھیں۔ جبھی تو اس کی آنکھیں فاختئی اور بال سرخی مائل تھیں۔ کلابہ سے لے کر باندرہ تک ان کی ان نیم ولائتی آنکھوں اور ایلوس پریسلے جیسی بھرکتی رانوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ کتنی آیا لوگ اس کی گکیدائی

کی آرزو میں ہلکان ہو چکی تھی۔ وہ تو ایک دفعہ فلم میں بھی کام کر چکا تھا۔ مگر ہیرو نے اپنا تھوبڑا ایسا آگے گھسیڑا کہ سب پیچھے کھڑے ہونے والے اداکار دھندلے دھندلے دھبے ہو کر رہ گئے۔ پھر بھی پہچاننے والی نظریں ان دھبوں میں اس کا والا دھبہ پہچان کر اور بھی اس پر نثار ہو گئی تھیں۔

جب کہیں بازی سے کام نہ چلا تو لوگوں نے بتایا کہ میگی کوئی ایسی ویسی آیا نہیں۔ انگلش بیبی کی آیا کے ہاتھ کے نیچے کام کر چکی ہے اور بھولی ناک والی غضب ناک ماما کی سگی والی ہے۔ پکا ڈھائی ہزار ڈاوری جمع ہے پینتالیس روپے مہینہ سندھی سیٹھانی دیتی ہے۔

تب پیٹر کو اس سے لَو ہو گیا۔ اور اس نے میگی کو ہر چہار طرف سے گھیر لیا۔ ایک دم ان کے سامنے ہی چرچ میں ڈٹنے لگا۔ وہ بچے کو لے کر بینڈ پر جاتی۔ پیٹر ساتھ جاتا۔ وہ صاحب سنگھ کے یہاں دوا لینے جاتی۔ پیٹر کھمبے سے لگا کھڑا ہوتا۔

یہاں تک کہ ماما کے پکے کان بھی پیٹر کی شکایتوں سے پک کر پھوڑا بن گئے۔ بات پادری تک پہنچی اور معاملہ طے ہونے کے بعد میگی کی منگنی آرسی چپاچپ بڑے ٹھٹے کے ساتھ ہو گئی۔

تب دونوں ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے لگے۔ پیٹر نے کئی بار جوہو کے کنارے یا چوپاٹی کے سنسان حصے میں اُسے دھانسنا چاہا۔ مگر میگی نے اسے ڈھیل نہ دی۔

ماما نے دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سفید ساٹن

کا فراک اور جھاگ سا ویل سب تیار ہو گیا - گلابی انویٹیشن کارڈ بھی چھپ آئے کہ ایک دن شام کو ریگل سینما کے آگے کچھ دنگا فساد ہونے لگا - پیٹر یونہی بیچ بچاؤ کرنے گھس پڑا نہ جانے کیسے چاقو اس کے پیٹ میں اتر گیا اور انتڑیاں سڑک پر جھول گئیں - سینٹ جارج ہسپتال جاتے جاتے پیٹر نے دم توڑ دیا

"او گاڈ! مائی گاڈ!" میگی نے میلی دری کو ناخنوں سے کھسوٹ کر پٹڑے پر سر پٹخنا شروع کر دیا - سلینا اس پر جھکی ہوئی موٹے موٹے آنسو بہا رہی تھی گوپال کتنی دیر ہوئی ٹیکسی لانے گیا تھا -

پیٹر مر گیا - ڈاوری کا روپیہ انویٹیشن کارڈ اور ہنڈال کا نصف کرایہ جو آٹھ دن پہلے بھرنا پڑتا ہے سب ڈوب گیا - میگی کا سنسار ڈوب گیا - دس سال کی کمائی ڈھائی ہزار - اب زندگی کے اور دس سال! زندگی کے کھاتے میں اتنی افراط کہاں - ایک زندگی میں ایک ہی نورے کا مول کمایا جا سکتا ہے ماما گواہ ہے جس کا نورا ڈاوری کا روپیہ لے کر مڈل ایسٹ بھاگ گیا - اور وہ جوں توں کر ماما ہی بن سکی - اب کوئی معجزہ میگی کے دن نہیں پھیر سکتا - نورا تو اب اس قیمت پر شاید ہی مل سکے - ہر چیز کے دام بڑھ گئے ہیں - بمبئی کے چھوکرے زیادہ تر ناجائز شراب کے دھندے میں رلتے جا رہے ہیں - اس دھندے میں شادی بیاہ کا کیا کام - اور پھر سب چھوکریاں میگی جیسی تھوڑا ہی ہیں - ٹکے سیر چھوکری ملتی ہے اُدھر ڈانڈا ایریا میں -

جس دن پہلی بار دلیپ نے میگی کو دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھریں - تو وہ ماما کی کھولی میں جا کر بڑی دیر تک بیٹی میں سے اپنا مرجھایا ہوا بیاہ کا جوڑا دیکھ

گرجیپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ سفید لیس کا ویل اژدھے کی کینچل کی طرح اس کا دم گھونٹنے لگا۔ اب اس جنم میں وہ کسی پیٹر کے پہلو میں آلٹر کے سامنے دو زانو ہو کر نہ جھک سکے گی۔ پادری کی دعائیں اب اس کے سر پر برکت کی بارش نہ کر سکیں گی۔ ماما کی طرح وہ بھی ایک دن اکیلی اور ویران، پرائے بچوں کے داغ دل پر لئے سمیٹتی رہے گی۔ اس کی ممتا کے مول سے جب کسی نوریے کے لائق ڈاوری جمع ہوگی تب تک زندگی اسے ویران کھنڈروں میں چھوڑ کر بوڑھی ہو جائے گی۔

دلیت ہوٹل کے ہیڈ باورچی کے ہاتھ کے نیچے کام کرتا تھا۔ بیس روپے اور جتنا کھا سکو اتنا کھانا۔ اس کی سگائی اچھے بھلے مراہٹے گھرانے میں ہو چکی تھی۔ چمپا نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ مگر ہیرن ڈرائیور کی منڈیر پر بیٹھی ہوئی کھوئی آنکھوں والی میگی نے صدیوں کی بندشوں کو توڑ کر اس کے سینے میں چھپے ہوئے عاشق کا دل چھو لیا تھا۔ دلیت ٹھنگنا تھا۔ اور مرحوم پیٹر لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں کالی تھیں۔ پیٹر کی فاختہ کے پروں جیسے ہمکتی ہوئی تھیں۔ پیٹر کو نکمی بولتا تھا اور پھٹی ہوئی انگریزی مگر دلیت کھڑکھڑاتی مرہٹی اور لنگڑاتی ہندوستانی مگر وہ بولتا کب تھا۔ وہ تو بس سلگتی ہوئی کوئلہ جیسی آنکھوں سے میگی کو ڈستا تھا۔ لوہے کے ناچیز ٹکڑے اور مقناطیس والا المیہ دو گھبرائے ہوئے جوان جسموں کو روندتا چلا گیا۔ میگی دلیت کے لئے اجنبی نہ تھی۔ وہ اس کا یار تھا اور یار کی محبوبہ کی شان میں کون ہے جس نے ٹھنڈی سانسیں نہیں بھری ہیں اور اب

میگی میں دوسری ڈاوری کمانے کا دم نہیں تھا۔

"میم صاحب۔ میگی ساری بنایا۔ رجسٹری کا سادی۔" سلیتا نے اسے سہارا دے کر پانی پلایا۔

"اوہ گاڈ —— ڈیر گاڈ!" میگی نے اس خدا کو پکارا۔ جو اس سے روٹھ چکا تھا۔ جس نے صلیب پر چڑھتے سے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ اس کے سارے دکھ ہرے کرے گا۔ مگر وہ خفا تھا۔ کیونکہ اس نے گنی گولڈ کی صلیب بیچ کر کڑکی کا نعانہ بتایا تھا۔ وہ اسے زندگی کے پرخار چوراہے پر اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ اس نے چرچ جانا چھوڑ دیا تھا۔ ہر اتوار کو صبح پانچ بجے حسب معمول اس کی آنکھ کھل جاتی مگر اب وہ ان مقدس حدود میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جہاں مصلوب یسوع مسیح کے خون میں ڈوبے قدموں میں سکونِ قلب ملتا ہے

رجسٹری کی شادی سے اس کے دل کا گناہ مدھم پڑنے کے بجائے اور بھیانک بن کر ابھر آیا۔ کچن میں باسی کھانوں کی سڑاند کے درمیان اسے شب عروسی مجسم حرام کاری معلوم ہوتی۔ ماناکو جلد ہی اس کی کلے گیجے سے غیر حاضری کی وجہ معلوم ہو گئی اور اسے دیکھ کر یک لخت پہچاننا تک چھوڑ دیا۔

دلیپ نے چونکہ غیر مذہب کی چھوکری ڈال لی تھی۔ اس لئے اس کے گھر والوں نے اُسے قطعی نظر انداز کر دیا۔ پیار پر بہت جلد احساسِ گناہ حادی ہو گیا۔ اسی زمانے میں کچھ ریسٹوران کے عملے نے سٹرائیک کر دیا اور دلیپ چھٹنی کی لپیٹ میں آ گیا اور کچن میں جیراتے ہوئے چند لمحوں کے ارد گرد ھتم کر رہ گئی۔

دو چھوٹے انسانوں کی حقیر مسرتیں بھی زیادہ زندہ نہ رہ سکیں - لال بیٹوں کی یلغار اور ڈسٹ بن کی سڑاند کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک نئی بھیڑ نے اس تل بھر کی دنیا میں آنے کا اعلان کر دیا - الٹیوں کے ہراول دستے معہ الٹیوں کے جگروں کے میگی کی ٹھٹھری ہوئی دنیا پر ٹوٹ پڑے - اس مژدہ جانفزا کو سن کر دلیپت نے اس کی کمر میں ایک شاندار لات رسید کی اور خوش نصیب باپ سل کے پاس بیٹھ کر دھاروں دھار رونے لگا - میگی نے قطعی برا نہ مانا - دلیپت نے وہی کیا جو شاید اس کے باپ نے اس کی آمد آمد کی خبر سن کر کیا ہوگا - صاحب لوگ کے بچوں کے سوا اس نے کبھی کسی انسان کی پیدائش پر شادیانے بجتے نہیں سنے تھے اگر اسی قسم کی خبر بار بار اس کے اپنے گھر میں نہ سنائی گئی ہوتی تو شاید نو برس کی عمر میں وہ اس بادہ پیمائی پر مجبور نہ ہوتی - پیالہ بھر جاتا ہے تب ہی چھلک اٹھتا ہے - مچلے ہوئے بابا لوگ کی ضدوں پر ہنس دینے کے عادی میگی نے دلیپت کے میلے سر کو اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی سے لگا کر تسلی دی کہ یہ کوئی اتنا بڑا جنجال نہیں جس سے امان ہی نہ مل سکتی ہو -

"او ماں —" خدا کی سنگ دلی سے ناامید ہو کر اس نے ماں کو یاد کیا - وہ ماں جس کی کوکھ میں وہ مان نہ مان میں تیرا مہمان بن گئی تھی - جس کا لہو پی کر وہ نادم تھی - جس نے پر نکلنے سے پہلے ہی اسے ٹھونگیں مار کر گھونسلے سے گرا دیا تھا - مگر جس سے اسے کوئی شکایت نہ تھی - پیالہ چھلکے تو قصور تو پانی کا ہوا نا!

دو چھوٹے انسانوں کی حقیر مسرتیں بھی زیادہ زندہ نہ رہ سکیں ۔ لال بیٹیوں کی یلغار اور ڈسٹ بن کی سڑاند کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک نئی بھیڑ نے اس تل بھر کی دنیا میں آنے کا اعلان کر دیا۔ الٹیوں کے ہراول دستے معہ الٹیوں کے جگروں کے میگی کی ٹھٹھری ہوئی دنیا پر لوٹ پڑے ۔ اس مژدہ جانفزا کو سن کر دلیپ نے اس کی کمر میں ایک شان دار لات رسید کی اور خوش نصیب باپ سل کے پاس بیٹھ کر دھاروں دھار رونے لگا ۔ میگی نے قطعی برا نہ مانا۔ دلیپ نے وہی کیا جو شاید اس کے باپ نے اس کی آمد آمد کی خبر سن کر کیا ہوگا۔ صاحب لوگ کے بچوں کے سوا اس نے کبھی کسی انسان کی پیدائش پر شادیانے بجتے نہیں سنے تھے اگر اسی قسم کی خبر بار بار اس کے اپنے گھر میں نہ سنائی گئی ہوتی تو شاید نو برس کی عمر میں وہ اس بادہ پیمائی پر مجبور نہ ہوتی ۔ پیالہ بھر جاتا ہے تب ہی چھلک اٹھتا ہے۔ مچلے ہوئے بابا لوگ کی ضدوں پر ہنس دینے کے عادی میگی نے دلیپ کے میلے سر کو اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی سے لگا کر تسلی دی کہ یہ کوئی اتنا بڑا جنجال نہیں جس سے امان ہی نہ مل سکتی ہو۔

"او ماں ــــ " خدا کی سنگ دلی سے ناامید ہو کر اس نے ماں کو یاد کیا۔ وہ ماں جس کی کوکھ میں وہ مان نہ مان میں تیرا مہمان بن گئی تھی۔ جس کا لہو پی کر وہ نادم تھی ۔ جس نے پَر نکلنے سے پہلے ہی اسے ٹھونگیں مار کر گھونسلے سے گرا دیا تھا۔ مگر جس سے اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ پیالہ چھلکے تو قصور تو پانی کا ہوا نا !

روشن

اصغری خانم دو باتوں میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ایک تو دین دھرم کے معاملے میں اور دوسرے شادیاں کروانے میں۔ اُن کی بزرگی اور پارسائی میں تو کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ سب کو یقین تھا کہ انھوں نے اتنی عبادت کی ہے کہ جنت میں ان کے لئے ایک شان دار زمرد کا محل ریزرو ہو چکا ہے۔ حوریں اور فرشتے وہاں اُن کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ وضو کا بدھنا۔ جا نماز اور تسبیح سنبھالے برقع پھڑکاتی جنت کی دہلیز پر ڈولی سے اتریں اور وہ انہیں دودھ، اور شہد کی نہروں میں تیرا کر پستے اور بادام کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں ٹہلاتے ہوئے زمرد کے محل میں بٹھا دیں اور ان کی سیوا میں جٹ جائیں۔

اصغری خانم کا غصہ ہمیشہ ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اگر ذرا بھی کسی جنتی

بیوی نے چیں چپڑ کی تو وہ اس کی سات پُشت کے مُردے اکھاڑنے لگیں گی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گی۔ اور دوزخ کی آگ کی پناہ لے گی۔

دُور دُور خانم کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں ساری دنیا کا کچا چٹھا معلوم تھا۔ مجال تھی جو کوئی ان کے سامنے بڑھ چڑھ کر بولے۔ غازی پور سے لے کر لندن تک کی ہر بدکار عورت کا بھید جانتی تھیں۔

"اے ہے موئی بیاہی تیاہی ڈھڈو نے نگوڑے بادشاہ کو پھانس لیا!" وہ مسز سمپسن اور ایڈورڈ ہشتم کے عشق پر تبصرہ کرتیں۔ "منہ جلی کو لاج بھی تو نہ آئی۔ میرا بس چلتا تو تخمی (جس نے تین خصم کئے ہوں) کا چونڈا جھلس دیتی۔"

مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ لندن سات سمندر پار تھا۔ اور ان کے گھٹنے میں آئے دن ٹیسیں اٹھتی رہتی تھیں۔ چونڈا جھلسنے کیسے جاتیں۔ اتنا دم ہوتا تو حج نہ کر آتیں۔

مگر شادیاں کرانے میں تو وہ ایسے ایسے معرکے مار چکی تھیں۔ کہ دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ قریب قریب ناممکن قسم کی شادیاں کرانے کا انہوں نے ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ جیسے وہ خود ہی آئے دن توڑا کرتی تھیں۔ بس اسی وجہ سے لوگ ان کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے کنواریاں کس گھر کا بوجھ نہیں ہوتیں۔ جس گھر میں چلی جاتیں لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے بھر جھک کر ان کی گالیاں کوسنے، طعنے، مہنے سنتے۔ انہوں نے ایسی ایسی ڈراؤنی شکل کی لڑکیوں کے نصیب کھولے تھے۔ کہ لوگوں پر ان کی ہیبت بیٹھ گئی

تھی۔ خاص طور پر یہ کنوارے لڑکے تو اُن سے ایسے کانپتے تھے جیسے وہ موت کا فرشتہ ہوں۔ نہ جانے کس پر مہربان ہو جائیں اور اپنے بٹوے میں سے کوئی پچھلی پائی نکال کر سر پر منڈھ دیں۔ جہاں کوئی شادی کے لائق نظر پڑ جاتی وہ پنجے جھاڑ کر اس کے ماں باپ اور سارے محلے ٹولے والوں کے پیچھے لگ جاتیں اور شادی کے قابل لڑکے تھرا اٹھتے۔ مگر وہ شادی کرا کے ہی دم لیتیں۔ کچھ ایسا پینترا چلتیں کہ الٹا لڑکا دہلیز پر ناک رگڑنے لگتا۔ لوگوں کا کہنا تھا ان کے قبضے میں جنات ہیں جو ان کا ہر حکم بجا لاتے ہیں۔

مگر ایک جگہ ان کے سارے ہتھیار کند ثابت ہوئے۔ تمام تعویذ گنڈے چوپٹ ہو گئے۔ ان کی اپنی ممیری بہن توفیق جہاں کی بیٹی صبیحہ کو چوبیسواں سال لگ چکا تھا اور ابھی تک کوار کوٹلہ جنا ہوا تھا۔ اس سے چھوٹی عقیلہ کی منگنی ہوئی تھی۔ عقیلہ کی پیٹھ کی میمونہ کالج میں پڑھتی تھی۔ سب سے چھوٹی منو تھی ــــ

قبر کے بھی چار کونے ہوتے ہیں۔ توفیق جہاں کی قبر چینی کھڑی تھی۔ آج تک خاندان میں نہ کوئی باہر کی لڑکی آئی تھی نہ گئی تھی۔ کھرے سیدوں کے گھرانے کو داغ لگانے کی کسے ہمت تھی۔ لڑکوں کا دن بدن کال پڑتا جا رہا ہے۔ کسی کی تنخواہ ٹھیک ہے تو ہڈی میں کھوٹ۔ کوئی کمبوہ ہے۔ تو کوئی پٹھان۔ ایک بے چارے انجینئر کی شامت آئی۔ پیغام بھجوا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہے ہے موئے انصاری ہیں۔ اصغری خانم نے ستیہ گرہ شروع کر دی۔ طوفان کھڑا کر دیا۔ ان کے جیتے جی بیٹی انصاریوں میں آ جائے

ایسی بھاری چھاتیوں کا بوجھ ہے تو کوئیاں میں ڈال دو۔

یہ جب کی بات ہے جب صبیحہ کو بیٹھا برس لگا تھا۔ اس کے بعد جب چھ برس چھ صدیوں کی طرح چھاتی پر سے دندناتے گزر گئے تو اصغری خانم کو اپنی پالیسی نرم کرنی پڑی۔ اور یہ طے پایا کہ اچھے خاندان کا لڑکا ہو تو زیادہ بڑا اندھیر نہیں۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ صبیحہ کوئی بدصورت ہو کہ کانی کھتری اور جاہل مراد میاں کا لٹھ ہو۔ ساتولی سلونی۔ لوٹا سا قد۔ نازک نازک ہاتھ پیر۔ کمر سے نیچے جھولتی ہوئی چوٹی۔ سوئی سوئی آنکھیں۔ جس میں قدرتی کاجل بھرا ہوا تھا۔ جی بھر کے دیکھ لو تو نشہ آجائے۔ ہنس دیتی تو موتی سے رل جاتے آواز ایسی میٹھی کہ نوحے پڑھتی تو سننے والوں کی ہچکی بندھ جاتی۔ اس پر سونے پر سہاگہ۔ علی گڈھ سے پرائیویٹ میٹرک پاس کر چکی تھی۔

مگر نصیب کی بات تھی، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ورنہ کہاں صبیحہ کہاں روشن۔ بڑھے بوڑھے کہتے ہیں عورت مرد کا جوڑا آسمانوں پر طے ہو جاتا ہے۔ اگر صبیحہ اور روشن کا جوڑ بھی آسمان پہ طے ہوا تھا تو ضرور کچھ گھپلا ہو گیا۔ فرشتوں سے کچھ بھول چوک ہو گئی۔ یہ دھاندلی آسمانی طاقت نے جان بوجھ کر اصغری خانم کو ستانے کے لئے تو ہرگز نہ کی ہو گی۔

مگر الزام سارا اصغری خانم کے ماتھے مخصوب دیا گیا۔ لڑکا لڑکی صفا چھوٹ گئے اور وہ دھرلی گئیں۔ صمد میاں کو کسی نے کچھ نہ کہا کہ وہ بہن کی بانہہ پکڑ کے اسے عذاب دوزخ جھیلنے کو جھونک آئے۔ سارا گھر منہ پیٹ کے رہ گیا۔ کسی کی ایک نہ چلی۔

ہائے اصغری خانم کہیں منہ دکھانے کی نہ رہیں ۔ کیا آن بان شان تھی بے چاریوں کی ۔ مجال تھی جو محلہ میں ان کے بغیر کوئی کاج ہو جائے ۔ کسی کی بٹیا کا کن چھیدن ہوتا تو انہیں دبوچ کر بیٹھنے کے لیے بلوایا جاتا ۔ کسی کے بال بچہ ہوتا وہی زچہ کا پیٹ تھام کر سہارا دیتیں ۔ پھر توفیق جہاں تو ان کی سگی ممیری تھیں اور روشن کو شیشے میں اتارنا کوئی کھیل نہ تھا ۔ اس لئے معاملہ انہی کو اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا ۔

صمد میاں چھ سال انگلستان رہ کر لوٹے تو بیٹے کی سلامتی کی خوشی میں توفیق جہاں نے میلاد شریف کروایا تھا ۔ بریلی والے میاں خاص طور پر میلاد پڑھنے تشریف لاتے تھے ۔ سب عورتیں اندر والے گول کمرے میں میٹھی ثواب لوٹ رہی تھیں ۔ لڑکیاں بالیاں چک سے لگی گھس پھس کر رہی تھیں کہ اتنے میں صمد میاں روشن کے ساتھ داخل ہوئے ۔ وہ شاید میلاد شریف کے بارے میں بھول ہی چکے تھے ۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید لوٹ جاتے مگر میاں صاحب نے گھور کر دیکھا تو پکڑے گئے ۔ مجبوراً دونوں ایک طرف بیٹھ گئے ۔

" ہائے یہ کون ہے ؟ " لڑکیوں نے روشن کو دیکھ کر کلیجے تھام لئے ۔ صمد میاں کے سارے دوستوں کو دیکھا تھا ۔ کمبخت سب ہی تو چمرخ مرگھلے اور گھونچو تھے ۔ مگر روشن اپنے نام کی طرح روشن تھے کہ آنکھیں چکاچوند ہو گئیں کلیجے منہ کو آنے لگے ۔ جیسے دیوار پھاڑ کر آفتاب سوا نیزے پر آ گیا ۔ کیا تیز تیز جگمگاتی آنکھیں جو ہنستے میں یوں کھو جاتیں کہ جی گم ہو جاتا ۔ دانت گویا موتی چن دیئے ہوں ۔ چوڑے چکلے شانے لمبی لمبی بت تراشوں جیسی سڈول انگلیاں اور

رنگت، جیسے مکھن میں زعفران کے ساتھ چٹکی بھر شہابی رنگ ملا دیا ہو۔ بچوں نے دیکھا کہ صبیحہ کے سلونے چہرے پر یکایک ہلدی بکھر گئی۔ گھنی گھنی پلکیں لرزیں اور جھپک گئیں۔ ہونٹ میٹھے میٹھے ہو گئے۔ لڑکیوں کو مکاری سے مسکراتا دیکھ کر بگڑ بیٹھی۔

صمد میاں اور روشن ننگے سر بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک ڈاڑھی والے بزرگ غرائے۔

"اے صاحبزادے اتنے بھی جنٹلمین نہ بنئے۔ میلاد شریف کے موقع پر ننگے سر بیٹھنے والوں کے سر پر شیطان دھولیں مارتا ہے۔"

روشن نے سہم کر صمد کی طرف دیکھا۔ انہوں نے جھٹ جیب سے رومال نکال کر چپاتی کی طرح سر پر منڈھ لیا۔ روشن نے بھی ان کی نقل کی۔ ہوا سے رومال اڑا تو بندر کی طرح سر پر ہتھیلی جما کر بیٹھ گئے۔ ایسی بھولی بھالی شکل لگی کہ لڑکیوں کی پارٹی میں گدگدی رینگ گئی۔ صبیحہ کے مکھڑے کی ہلدی میں ایک دم گلال گھل گیا اور نارنجی رنگ پھوٹ نکلا۔

ڈاڑھی والے حضرت جو مونچھ ڈاڑھی صفاچٹ ولایت پلٹ لڑکوں کی گھات میں بیٹھے تھے اور اپنی قہر آلود نگاہیں دونوں پر گاڑ رکھی تھیں مگر یہ دونوں بھی چوکنے بیٹھے تھے اور بالکل بندروں کی طرح ان کی نقل میں آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر سن رہے تھے۔ اور سر دھن رہے تھے۔ بڑے میاں نے درود پڑھ کر انگلیوں کے پوروں کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ جھٹ صمد میاں نے ان کی نقل کی اور روشن کو کہنی ماری۔ انہوں نے بھی بوکھلا کر جلدی سے

انگلیاں چوم لیں - ایسے بھونڈے پن سے کہ لڑکیوں کے دل اُچھلنے لگے بڑے میاں کا جی خوش ہوگیا - وہ انہیں بڑے فخر سے بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھنے لگے - سید کا بیٹا انگلستان کیا امریکہ بھی چلا جائے، رہے گا کھرا سیّد - مگر لڑکیوں کو خوب معلوم تھا - کہ ان لوگوں کو خاک کچھ یاد نہیں یونہی ملاؤں کی طرح بُدبُد ہونٹ ہلا رہے ہیں - ان کی اس شرارت پر اتنی بری طرح ہنسی کا حملہ ہوا کہ صغرا خانم نے دُور سے پنکھے کی ڈنڈی دکھا کر دھمکایا - تب کہیں جا کر ہنسی نے دم توڑا -

میلاد شریف کے خاتمے پر جب سلام پڑھا گیا تو سب کھڑے ہو گئے بڑے میاں نے محبت سے لڑکوں کی طرف دیکھ کر سلام پڑھنے میں شریک ہونے کا اشارہ کیا -

" پڑھو میاں، خاموش کیوں ہو؟"

" جی — ! — جی !!"

" خدا کے حضور میں جو دل سے نکلے، وہی اسے منظور ہوتا ہے " انہوں نے روشن کو ایسے گھورا کہ وہ سہم کر ساتھ دینے لگے کہ بڑے میاں پر تو رقت طاری ہوگئی - ولایت پلٹ لڑکوں سے بدظن تمام بزرگ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر رہ گئے -

" ارے صاحب سچا مسلمان چاہے کافروں میں رہے چاہے مسجد میں اس کے ایمان پر داغ نہیں پڑتا - ماشاء اللہ روشن میاں کے گلے میں عقیدے کا سوز بھرا ہوا ہے -" بڑے میاں نے آستین کے کونے سے آنکھیں صاف

کر کے فرمایا، اور روشن کے چہرے پر نور کی چمک دمک دیکھ کر کھل اٹھے۔

صبیحہ کی کٹورہ جیسی آنکھیں چھل چھل برس پڑیں۔ ٹکٹکی باندھے وہ انہیں تکتی رہ گئی۔ جب لڑکیوں نے قاعدے کے مطابق اسے چھیڑا۔ تو وہ جھوٹوں کو بھی نہ بگڑی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پرانا جان پہچان کا مل گیا ہو۔

صمد میاں جب گھر میں آئے تو ہر ایک کا چہرہ روشن کے پرتو سے جگمگا رہا تھا۔ سوائے صبیحہ کے جس نے چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بھرمار کر دی۔ کون ہیں۔ کیا کرتے ہیں ؛

"اے کس کا لڑکا ہے" صغرا خانم نے لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

"اپنے باپ کا!" صمد نے لاپروائی سے ٹال دیا۔ اور چائے باہر بھجوانے کے لئے کہا۔

"اے ہے لڑکے ہر وقت کا مذاق نہیں بھاتا۔ یہ بیت اس کے باپ کون ہیں ؟

"ہیں نہیں، تھے۔ فورسٹ آفیسر تھے۔ تین سال ہوئے ڈیتھ ہو گئی ان کی"

"انا للہ و انا الیہ راجعون! کیا کرتا ہے لڑکا ؛ نانی بی نے پوچھا۔

"کون سا لڑکا ؟" صمد میاں نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

"اے یہی تیرا دوست"

"روشن۔ ڈاکٹر ہے۔ ایم۔ ڈی کی ڈگری میرے ساتھ ہی لینے گیا تھا۔ پھر وہیں انگلینڈ میں نوکری کر لی۔ کچھ کھانے کو بھجوا دیجئے۔ مگر میرے کمرے

میں بھجوا دیجئے گا۔ باہر درجن بھر بڈھے بیٹھے ہیں۔ سب ہڑپ کر جائیں گے۔
یہ بڑھاپے میں لوگ اتنے ندیدے کیوں ہو جاتے ہیں !"

صغرا خانم فوراً خم ٹھونک کر میدان میں پھاند پڑیں۔ تیر تلوار سنبھالے
اور ہلہ بول دیا۔

" اے صمد میاں جیسے تم ویسے تمہارا دوست۔ اس سے کیا پردہ ؟ ادھر
ہی گول کمرے میں بلا لو" وہ آنکھوں میں رس گھول کر بولیں ۔" ان دنوں سیدوں
میں بھی کانا پردہ شروع ہو گیا ہے۔ خاندان کے بڑے بوڑھے کی آنکھ بچا کر،
لڑکیاں کھلے منہ نمائش میں جائیں، مشاعروں میں شریک ہوں۔ سہیلیوں
کے بھائیوں اور بھائیوں کے دوستوں سے بڑی بوڑھیوں کی رضامندی لے کر
ملیں۔ مگر سڑک پر جاتے وقت تانگے میں پردہ باندھا جاتا ہے۔ بزرگوں کو
دکھانے کے لئے۔ صمد روشن کو گول کمرے میں لے آئے۔ صبیحہ کے سوا سب
وہیں چائے پینے لگے۔

صبیحہ کو صغرا خانم کمرے میں گھیرے چوکھے جملے کر رہی تھیں۔ اس کا بس
چلتا۔ تو جہیز کا کوئی بھاری نہ تار جوڑا پہنا دیتیں۔ مگر صبیحہ حسب عادت بڑی
بڑی آنکھوں میں آنسو لئے اسو ہی تھیں۔ گھر میں جب کوئی موٹا مرغا آتا۔ اُسے
یونہی سجایا جاتا۔ بے چاری کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے، منہ لٹک جاتا۔ اور
ناک پر پسینہ پھوٹ نکلتا۔ اور شکل چوہی ڈبلی کی سی ہو جاتی۔ جب سے کئی پیغام
آکر پھر گئے۔ تب سے اُسے اور بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ روشن جیسا پینڈا سم
ہو سکتا ہے اس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ دو بچے ہوں !

مگر اصغری خانم کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ نہ انہوں نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا تھا۔

"لونڈا خیر سے کنوارا ہے، بیاہے مرد کا ڈھنگ ہی اور ہوتا ہے۔" دوسرے انہوں نے پہلے ہی صمد سے پوچھ لیا تھا۔

"بیوی بچے سنگ ہی ہیں؟"

"کس کے؟ روشن کے ــــ ارے اس گدھے کے بیوی بچے کہاں۔ ابھی تو خود ہی بچہ ہے۔ مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔"

بس اصغری خانم نے جھٹ حساب لگا لیا کہ صبیحہ سے چار سال بڑا ہوا۔ خوب جوڑی رہے گی۔ اس سے کم فرق ہو تو چار بچوں بعد بیوی میاں کی اماں لگنے لگتی ہے۔ ویسے مرنے والے تو اصغری خانم سے بیس برس بڑے تھے۔ ہائے کیا عشق تھا اپنی دلہن جان سے!

مگر جب اصغری خانم سجا بنا کر صبیحہ کو گول کمرے میں لائیں تو روشن جا چکے تھے۔ اصغری خانم کا بس چلتا تو چیختی چلاتی ان کے پیچھے لپکتیں مگر صمد میاں کی انہوں نے خوب ٹانگ لی۔

"جوان بہنیا کی یاں کب تک ڈالو گے۔ کیا سفید چونڈے میں افشاں چنی جائے گی۔ تم ہی کچھ نہ کرو گے تو کون کرے گا؟"

"کون! میں؟" صمد خواہ مخواہ چڑ گئے۔ "مجھ سے خود تو اپنی شادی ہو نہیں رہی ہے دوسروں کی کیا کروں گا؟"

"مذاق میں ہر بات کو ٹال دیتے ہو۔ آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو ــــ"

اصغری خانم ٹسر ٹسر رونے لگیں۔ "آخر کیا ہوگا ان چار چٹانوں کا — ؟ توفیق نگوڑی کو ہول دل کے دورے نہ پڑیں تو اور کیا ہو —"

"کون سی چٹانیں ؟" صمد میاں انجینئر تھے۔ انہیں چٹانوں، پہاڑوں سے بڑی دلچسپی تھی۔

"اے میاں، اب بنو مت۔ اللہ رکھے اب تم اس قابل ہو، اپنے دوستوں میں سے ڈھونڈو کوئی۔"

"بھئی میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا"۔ وہ ٹال کر چل دیئے۔

مگر آندھی ٹلے، طوفان ٹلے، اصغری خانم کو کون ٹالے ؟ آتے جاتے ٹانگ لیتیں۔ پھر انہیں ایک انوکھی ترکیب سوجھی۔ وہ فوراً کسی جان لیوا، اور انجانے مرض میں مبتلا ہوگئیں اور عین اس وقت جب روشن صمد میاں سے ملنے آئے، ان پر سخت بھیانک قسم کا دورہ پڑ گیا۔ اتنی زور زور سے آہیں بھریں کہ بے چارے بدحواس ہو گئے۔ جھٹ سے نوکر کو بھیج کر اپنی ڈسپنسری سے بیگ اور انجکشن منگوائے۔ بڑی دیر تک دیکھتے بھالتے رہے اصغری خانم آخری وقت میں بھلا صبیحہ کا ہاتھ کیونکر چھوڑ دیتیں۔ وہ اُن کے سرہانے سہمی ہوئی بیٹھی رہیں کہ کہیں چور پکڑا نہ جائے۔ انہیں خاموش دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اصغری بوا کی چال پکڑی گئی۔

"کیا بیماری ہے ؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یہ پوچھیئے کون سی بیماری نہیں ہے۔ گردوں کی حالت خراب ہے معدہ قطعی کام نہیں کرتا۔ دل بس ذرا سا دھڑک رہا ہے۔ آنتوں میں زخم ہیں پھیپھڑوں

کے نیچے پانی اتر آیا ہے۔" انہوں نے صمد کو ایک طرف لے جاکر کہا۔ صبیحہ نے سنا تو ہنسی نہ روک سکی۔ اصل مرض کی طرف تو انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

" اماں ہٹاؤ بھی، اتنی بیماریاں ہوتیں تو زندہ کیسے رہ سکتی تھیں اور زندہ بھی کیسی، سارے خاندان پر چابک پھٹکارتی ہیں۔" صمد بولے

" یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ یہ زندہ کیسے ہیں۔ کچھ ایسی لیپا پوتی ہوتی رہتی ہے کہ کھنڈر کھڑا ہے۔ ڈاکٹری سے بڑھ کر کوئی طاقت کام کر رہی ہے"۔ صغری بوا ٹھنکیں اور بدک اٹھیں۔

" اوئی تو بہ ــــ دور پار ــــ اے لو میرے دشمن کا ہے کو لب گور ہوتے اے میاں تم ڈاکٹر ہو کہ نرے سلوتری۔ اے چولھے میں جائیں تمہاری دوائیں۔ موٹے فرنگیوں کی دواؤں میں دنیا بھر کی غلاظتیں ہوتی ہیں ــــ تھو ــــ" وہ بڑبڑائیں۔

" بس اللہ پاک عزت آبرو سے اٹھالے۔ اے لڑکے ٹھیک سے بیٹھ! نگوڑیو، کچھ شربت پانی لاؤ کہ گدھیوں کی طرح کھڑی منہ دیکھ رہی ہو۔ اے بچے کے بہنیں ہیں تیری ــــ ؟" اچانک صغرا خانم نے پینترا بدلا۔

" اں ؟ ــــ جی دو ــــ دو بڑی بہنیں ــــ ایک بیوہ ہے"۔ روشن نے سنبھل کر وار روکا۔

" چہ ہے ہے ــــ دوسری کہاں بیاہی ہے ؟"

" کانپور میں سول انجینئر ہیں ان کے ــــ"

"اے کانپور ہی میں تو اپنے تقی میاں کی خلیا ساس رہویں ہیں — کیا نام ہے اللہ رکھے بہنوئی کا —؟"

"ایس۔ این کچلو"، صمد میاں بولے۔ "کیوں، کیا کچھ بنوانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں اپنی قبر بنواؤں گی — اچھا، تو تم لوگ کشمیری ہو" بے چاری کچھ بجھ گئیں۔ "یہ سیف الدین کچلو کے خاندان سے ہے کچھ میل؟"

"جی۔ وہ میرے چاچا کے دوست تھے۔"

روشن کے جانے کے بعد مریضہ تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔

"بھئی سوچ لو کشمیری ہیں؟"

"ہاں! اس سے پہلے جو پیغام آیا تھا۔ وہ لوگ کمبوہ تھے۔ بس یہی دیکھتی رہو۔ اے سب انسان برابر ہیں۔ پاک پروردگار نے سب کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات چھوت چھات نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں بگڑنے لگیں۔

"بھئی مجھے یہ صبیحہ کے نخرے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔ ادھر وہ آیا اور ادھر یہ منہ تھوتھا کر بھاگیں۔ جی چاہا لگاؤں چڑیل کے دو چانٹے۔"

مگر صبیحہ کیا کرتی۔ روشن کے آتے ہی وہ کمرے میں بھاگ جاتی۔ یوں سب کے سامنے گھور کر دیکھتی تو نہ جانے وہ کیا سوچتے۔ دروازے کی آڑ سے مزے سے جی بھر کے دیکھ سکتی تھی۔ اب تو علاج کے لئے وہ بلا ناغہ آنے لگے۔ اصغری خانم کچھ ایسی ترکیب چلتیں کہ صبیحہ کو پاس روک لیتیں اور بے چارے روشن تو ایسے جھینپو تھے کہ صبیحہ بھی شیر ہو گئی۔ انہیں ایک نظر بھر کے اپنی کالی بھونرا آنکھوں

سے دیکھتی تو ان کے ہاتھ میں انجکشن کی سوئی کانپنے لگتی۔ وہ ہنس پڑتی تو گھبرا کر بچوں کی طرح ناخن کترنے لگتے۔ تب وہ اور بھی دیدہ دلیر ہو جاتی۔

"ڈاکٹر صاحب، ہماری بلی کا جی اچھا نہیں"

"کیا ہو گیا؟"

"پتہ نہیں۔ بے چاری کھوئی کھوئی سی رہتی ہے"۔

"اوہو۔ معلوم ہوتا ہے بے چاری کا دل ٹوٹ گیا ہے"۔

"ارے واہ۔ کیوں؟"

"آپ روٹھ گئے ہوں گے" وہ دبی زبان سے کہتے۔

"اجی ہاں! میں کیوں روٹھتی"۔ صبیحہ کالی کالی پلکیں جھپکاتی

"تو پھر ڈرتی ہو گی آپ سے"۔

"واہ۔ کیا میں اتنی ڈراؤنی ہوں؟"

"ڈراؤنی چیزوں سے تو ڈرپوک ڈرتے ہیں"۔

"اور بہادر؟"

"کالی کالی آنکھوں سے"۔

دونوں انگریزی میں نوک جھونک کئے جاتے تو اصغری خانم کو گھبراہٹ ہونے لگتی۔ بھلا گٹ پٹ کر کے بھی کہیں پیار کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ موئی کافروں کی زبان میں "لفٹ رائٹ کوئک مارچ" کے سوا کیا ہوتا ہے؟ وہ ایک دم بیچ میں کود پڑتیں۔

"اے روشن، میرے چاند، ذرا میری بالو شاہیوں پر نیاز تو دے دے۔ تیرے

خالو میاں کی برسی ہے۔" وہ فوراً ہوشیاری سے رشتہ لگانیں۔

"کون، میں؟" روشن بوکھلا گئے۔

"آپ بھی حد کرتی ہیں اصغری خالہ۔ ان سے فاتحہ پڑھوا کر اپنی عاقبت خراب کرنے کا ارادہ ہے۔ بھلا انہیں کیا خبر کہ فاتحہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ایک آیت بھی یاد نہ ہوگی۔" صبیحہ اڑانے لگی۔

"اچھا ملانی جی، آپ بیچ میں نہ بولیں۔" روشن چڑ گئے۔

"ارے صاحب چھوڑیئے، ہمیں معلوم ہے، آپ اور صمد بھیا میں کیا کچھ فرق ہے۔ وہ بھی تو صاحب بہادر بن گئے ہیں۔"

"خالہ جی! آپ روشن سے فاتحہ پڑھوا رہی ہیں؟" صمد نے قہقہہ لگایا۔

"اے غارت ہو کل موہو۔ لعنت ہو۔ آج کل کے موئے لونڈے ہیں کہ نگوڑے سب کے سب بے دین"! صغرا خانم بالو شاہیوں کا تھال اٹھا کر دالان میں لے گئیں مگر بے چاری کی فکر دور نہ ہوئی۔

"اے توفیق جہاں"

"ہاں کیا ہے؟" توفیق جہاں نے پنکھے سے مکھی کو دھکا کر جواب دیا۔

"اے میں کہوں، یہ آج کل کے لڑکوں کے نکاح کیسے پڑھے جاویں گے؟"

"کیوں؟"

"اے انہیں ــــ آمنتو بھی نہیں آتی"۔ آمنت باللہ۔ ایک آیت ہوتی ہے جو نکاح کے وقت دولھا کو پڑھنی پڑتی ہے۔ جس میں وہ اقرار کرتا ہے کہ میں خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔

اس آیت کو پڑھے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔

"قاضی جی بولتے جاتے ہیں اور دولہا دہراتا جاتا ہے۔ بس بہن اب تو ویسے ہی نکاح ہو رہے ہیں۔" توفیق جہاں بولیں۔

"مگر اب اس نیاز کا کیا ہو؟" وہ فکرمند ہو گئی۔

"کیسی نیاز ——؟"

"ارے بھئی میں نے تو جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ ان کی برسی ہے۔ یہ منت کی نیاز ہے۔ لڑکا خود ہی نیاز دے جب ہی پوری ہوگی۔"

"اے چلو ادھر۔ ایسی کوئی منت نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں نے ٹالنا چاہا ——

"نہیں جی تم تو کسی بات کو مانتی ہی نہیں ہو۔ خیر پھر سہی۔" اور وہ دوپٹہ سر پر منڈھ کر بڑبڑ نیاز دینے لگی۔ لگیں

دوسرے دن روشن آئے۔ تو جھٹ پوچھا۔ "کیوں رے تو نے قرآن ختم کیا تھا؟"

"جی؟ —— نہیں تو ایک بار انگریزی میں پڑھا تھا۔ تھوڑا سا۔ تو —" روشن ہکلائے۔

"ہے ہے، یہ موئی لکڑ توڑ زبان میں کیسا قرآن؟" لڑکے دیوانہ تو نہیں ہوا

"تو صمد بھیا نے کون سا پڑھ لیا ہے۔ ساری عمر انگریزی اسکولوں میں رہے کالج میں فرصت نہ ملی۔ اس کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔" مگر صبیحہ خود ہر رمضان کے مہینے میں پانچ قرآن ختم کرتی تھی۔ روزے نماز کی پابند تھی۔ حالانکہ صمد کہتے تھے وہ نازک بدن بننے کے لئے فاقے کرتی تھی۔ توبہ۔ توبہ!

سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ روشن کی آنکھوں سے دل کے راز کا پتہ بچے بچے کو چل چکا تھا۔ مگر زبان نہ جانے کیوں گنگ تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ایک دم آنکھوں میں غم کا اتھاہ سمندر ہٹھاٹھیں مارنے لگتا اور سر جھکا کر اٹھ کر چلے جاتے صبیحہ کی طرف ایسی ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں کھڑی ہو۔ درمیان میں فولادی سلاخیں ہوں اور کالے دیو کا پہرہ۔ صبیحہ کے مکھڑے پر غرور اور اطمینان کا نور پھوٹنے لگا تھا۔ جیسے منزل پر پہنچ کر آرام سے چھاؤں میں بیٹھ گئی ہو۔ ساری انجانی کسک اور تنہائی مٹ کر گھروندا جگر مگر کرنے لگا ہو۔

مگر دقت یہ تھی کہ لڑکے کا یہاں کوئی ہے نہیں۔ پھر پیغام کیسے منگوایا جائے۔ آج کل شادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ دو جنوں کا ایک دوسرے پر جی آگیا۔ دوستوں نے پیغام دیا۔ یاروں نے شادی کرلی۔ اصغری خانم کو ایسی ٹکڑا توڑ شادیوں سے نفرت تھی۔ مگر زمانے کے نئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر نئی وضع کی شادیوں سے بھی انہوں نے رو پیٹ کر سمجھوتہ کرلیا تھا۔ پہلے پہل جب نصرت اور خلیقہ نے ایسی چٹ پٹ شادی کی تھی تو انہوں نے بڑا شور مچایا تھا۔ مگر پھر انہیں اپنی پالیسی نرم کرنا پڑی۔

ادھر روشن بھونڈو تھے۔ ادھر صبیحہ بھی ذرا چنڈٹ ہوتیں تو کبھی کا اُنھیں ڈکار چکی ہوتیں۔ کاش اسے کوئی چھوٹی موٹی پیاری سی بیماری لگ جاتی تو روشن اس کا علاج کرتے کرتے خود مرض مول لے بیٹھتے۔ اصغری خانم گھیر گھیر کے مرغی کو ڈربے میں پھانسنے کی کوشش کرتیں، مگر اپنے منہ کی کھا کر رہ جاتیں۔

"اے لڑکی تیرے سر میں آدھے کا درد ہووے ہے۔ علاج کیوں نہیں کرالیتی ڈاکٹر سے؟" وہ صبیحہ کو رائے دیتیں۔

"اے واہ خالہ جی، میرے سر میں کاہے کو ہوتا درد۔" وہ بگڑ نے لگتی گدھی۔

"پہلے تو ہووے تھا، اب بھلی چنگی ہو گئی ہو تو مجھے خبر نہیں"۔ وہ صبیحہ کی صحت سے جل کر کہتیں۔ "دیکھ تو بیٹا روشن کیسی جھلس کر رہ گئی ہے بچی!"

"ارے خالہ جان ان کی تو رنگت ہی سیاہ بھٹ ہے۔ کہیئے تو کھال کھینچکر دوسری چڑھا دوں، پلاسٹک سرجری سے"۔

"جی ہاں بڑے آئے کھال کھینچنے والے۔ ہم کالے ہی بھلے"۔

"اوئی کالی کدھر ہے لونڈیا۔ ہاں گیہواں رنگ ہے"۔ اصغری بوا پریشان ہو کر کہتیں۔

"جی ہاں، اِدھر کچھ دنوں سے امریکہ سے گیہوں بھی کالا ہی آرہا ہے"۔ روشن چھیڑتے ــــ

"ہاں بس ایک آپ ہی زمانے بھر میں گورے ہیں، ہونہہ پھیکے شلجم۔" صبیحہ چڑ جاتی۔

"آپ تو نمک کی کان ہیں، چلیئے کچھ تو مزہ آجائے گا"۔ وہ چپکے سے کہتے۔

صغرا خانم بدمزگی مٹانے کو جلدی سے بات بدلتیں۔ "اے کالی گوری رنگتیں سب اللہ کی دین ہیں۔ پرسوں کہہ رہی تھی۔ سر بھاری ہے۔ ویسے تیرے بال بھی تو جھڑ رہے ہیں۔ بیٹا کوئی بال بڑھانے کی دوا بتاؤ"۔

"ارے خالہ جی! بہت بال ہیں۔ ہاں کہئے تو دماغ کو بڑھانے کے دو چار

انجکشن لگا دوں"۔

"آہاہا، بڑے آئے سلوتری جی"۔ اور روشن کا چہرہ ہنستے ہنستے صبیحہ کے گلابی آنچل کو مات کرنے لگتا"۔

صغرا خانم اس کچر پچر سے اداس ہو کر بڑی زور زور سے کراہنے لگتیں۔ ایک دن انہوں نے صمد کو گھیر کر بات کر ہی ڈالی۔

"اے بھیا کوئی پیغام نہ الغام"

"کیسا پیغام"؟

"اے روشن کا — اس سے کہو اپنی بہن بہنوئی سے پیغام بھجوائے۔

"مگر خالہ جی روشن —"

"ہاں ہاں بیٹے، مجھے سب معلوم ہے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ہزاروں شادیاں ہو رہی ہیں۔ کب تک لڑکی بٹھائے رکھیں گے؟ توفیق جہاں کا دل کوئی دن اور کام دے گا۔ پھر دونوں میں اللہ رکھے چاؤ بھی ہے"۔

"مگر — خالہ جی"!

"بیٹے، تم اللہ رکھے سات سمندر پار رہے۔ تمھیں کیا معلوم۔ دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ سیدوں کی بیٹیاں کن کن کو گئیں۔ سرفراز میاں کی لڑکی نے تو زہر کھالیا۔ اب اللہ کی مرضی یہی ہے تو جہالت کی باتوں میں پڑنے سے کیا حاصل"۔

"مگر — میں سوچوں گا —" صمد میاں چکراتے سے، جاکر باہر پڑ گئے۔ اس انقلاب کی انہیں امید نہ تھی۔ دنیا سے دور وہ کتنے جاہل رہ گئے جبکہ ان کے بزرگ تک اتنے روشن خیال ہو چکے تھے۔ ان کا دل غرور سے بھر گیا۔ شام کی

گاڑی سے انہیں سائنس کانفرنس میں شرکت کے لیئے جانا تھا۔ اب وہاں سے لوٹ کر ہی سب کچھ ہوگا۔

ادھر اصغری خانم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ یہاں بیٹی بیاہنی تھی۔ اس لیئے توفیق جہاں کو کہہ سن کر پٹا لیا کہ صبیحہ بیکار وقت برباد کرنے کے بجائے اگر کچھ کام سیکھنے لگے تو کیسا رہے، طے ہوا کہ روشن میاں کی ڈسپنسری میں نرسنگ سیکھنے چلی جایا کریں بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، اور صبیحہ نرسنگ سیکھنے جانے لگی۔ جس کا سبق صبح سے لے کر رات کے سینما کے آخری شو تک چلتا رہتا۔ اور صبیحہ چست چالاک نرس کے بجائے دن بدن اس جانے پہچانے مرض میں کھوتی گئی جو جنم جنم سے مرد عورت کو سونپتا آیا ہے۔ روشن کے سوئٹر بنے جانے لگے اور کمرے میں ان کی قمیص، ان کے موزے بکھرے سے گئے۔ بس چودہ طبق روشن ہو گئے۔

جیسے ہی شکار گرتا ہے، شکاری جو مکر کا نٹھے جھاڑیوں میں دبکا ہوتا ہے ایک ہی جست لگا کر آدبوچتا ہے اور گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔ اصغری خانم نے بھی ساری بیماری دور پھینکی اور دھم سے اکھاڑے میں آن جمیں۔ بھیا جھپ جہیز سلنے لگا۔ بڑی دیگوں جیسے لحاف توشک کے انبار اتار کر قلعی ہونے لگی ڈیوڑھی پر ستار بیٹھ گیا۔ کہ سامنے نہ ہواؤ تو موا اکیلے ٹھوپ دے گا۔ بی سیدانی محلے کی پوٹ سنبھال کر ڈھولی جمیا اور گوکھرو توڑنے لگیں۔ گوکھرو کے ہر کنگورے پر لپ بھر کے دعائیں دیتی جاتی۔ گوئیاں سہاگ اور بنرے یاد کر کے کاپیوں میں اتارنے لگیں۔ گورے دولھا اور سانولی دلھن پر گیت جوڑے جانے لگے۔

"اے بی باپ کا نام روشن تو بیٹے کا۔؟" صغرا خانم فکرمند ہو کر پوچھتیں۔
"جوشن!"
کوئی شوخ سہیلی چھیڑتی، اور صبیحہ جل کر اس کی بوٹیاں نوچنے لگتیں۔
"اے بی انہیں اپنی کلورانی پسند ہے، تم لوگ کاہے کو جلی مرتی ہو۔"
صغرا خانم ڈانٹتیں اور صبیحہ آنکھوں میں خوابوں کے جھمگٹے لئے نرسنگ سیکھنے بھاگ جاتیں۔
مگر کسے خبر تھی قسمت یہ گل کھلائے گی۔ پل بھر میں چمکتا سورج الٹا توا بن جائے گا۔ وہی روشن جو گل رنگ، چودھویں کے چاند کو شرمارہے تھے، یا لوٹ پوٹ کر کھڑے ہوئے تو کالا دیو! اور اس کالے دیو نے پلک جھپکاتے میں اونچے اونچے محلوں کو چکنا چور کر دیا۔ صغرا خانم کے سارے نئے پرانے مرض ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے۔ جب صمد میاں کانفرنس سے جم جم لوٹے تو گھر میں جیسے کوئی میت ہو گئی ہو۔ سناٹا بھائیں بھائیں کر رہا تھا صغرا خانم کا ایک کوسنا زمین تو ایک آسمان —— زمرد کا محل ساتویں آسمان پر لرزا اور ایک دم پھُس سے بیٹھ گیا۔ قلعی کی دیگوں پر پھر لحاف توشک لد گئے۔ دھنک کی پنڈیاں الجھ کر جھونج بن گئیں۔ سنار ڈیوڑھی سے دھتکار دیا گیا اور حسن نے سنا منہ پیٹ لیا۔
آخر ہوا کیا —— کچھ معلوم تو ہو۔" صمد میاں نے پوچھا۔
"ارے اس چھپتیسی سے پوچھو، جو چڑھ چڑھ کے دیدے لڑاتی جاتی تھی۔"

توفیق جہاں نے زانو پیٹ لیا — "حرافہ — !"

اور دیدے لڑانے والی تھپتیسی، حرافہ اپنے کمرے میں بیٹھی اپنا کالا کلوٹا منھ گھٹنوں میں چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کی زندگی کا روشن سورج گہنا چکا تھا۔ اور اس کی کرنیں آگ بن کر کلیجے کو پھوکے دے رہی تھیں۔

صمد نے اس کی پیشانی چوم کر اپنے سر کی قسم دلائی تو اس نے سر اوندھائے اوندھائے اُن کے سامنے مٹھی کھول دی۔

اس کی سانولی ہتیلی پر ایک مڑا تڑا کارڈ پڑا منھ چڑا رہا تھا۔

مگر خالہ بی نے تو کہا تھا، اب زمانہ بدل گیا ہے۔

صمد میاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کارڈ کو گھور رہے تھے۔ جس پر لکھا تھا "روشن لال کچلو — !"

دو ہاتھ

رام اوتار لام پر سے واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چھٹی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہو گئی تھی نا! اس لئے رام اوتار تین سال بعد واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹما رہے تھے۔ مارے شکر گذاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوا لیا۔

بڑھیا پچاس برس کی ہوگی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے اُن میں سے بس رام اوتار وا بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آ گئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچائی مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اس کے پیر چھونے آیا تو اس کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی سب اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ رام اوتار لام

پر توپ بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا۔ پھر بھی سپاہیوں کا میلا اٹھاتے اٹھاتے اس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گئی ہو گی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پُرانا رام اوتار واقعی نہ رہا ہو گا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سُنے اور اس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا سمسی تھی گوری۔ جب تک رام اوتار رہا اسکا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا اور کسی نے اس کے رُخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا جب خصم نہ گیا تو کیا بلک بلک کر روئی تھی جیسے اس کی مانگ کا سیندور ہمیشہ کے لئے اڑ رہا ہو تھوڑے دن روئی روئی آنکھیں لئے سر جھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ سارا بسنت رت کا کیا دھرا ہے۔ کچھ صاف گو کہتے تھے۔ گوری تھی ہی چھنال۔ رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہو گئی کمبخت ہر وقت ہی ہی۔ ہر وقت اٹھلانا۔ کمر پر میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی لوگ بدحواس ہو جاتے۔ دھوبی کے ہاتھ سے صابن کی بٹی پھسل کر حوض میں گر جاتی۔ باورچی کی نظر توے پر سلگتی ہوئی روٹی سے اُچٹ جاتی۔ بہشتی کا ڈول کنوئیں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپراسیوں تک کی بلّا لگی پگڑیاں ڈھیلی ہو کر گردن میں جھولنے لگتیں اور جب یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گزر جاتی تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتے میں رہ جاتا۔ پھر ایک دم چونک کر وہ ایک دوسرے کی درگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے۔ دھوبن مارے غصے کے کلف کی کونڈی لوٹ دیتی۔ چپراسن چھاتی

سے چمٹے لونڈے کے بے بات دھمو کے جڑنے لگتی۔ اور باورچی کی تیسری بیوی پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔

نام کی گوری تھی۔ پر کمبخت سیاہ بہت تھی جیسے الٹے توے پر کسی پھاوڑیا نے پراٹھے تل کر چکتا ہوا چھوڑ دیا ہو۔ چوڑی پھکنا سی ناک، پھیلا ہوا دہانہ، دانت مانجھنے کا اس کی سات پشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں میں پلیوں کا جل، تھوپنے کے بعد بھی دائیں آنکھ کا بھینگا پن، اوجھل نہ ہو سکا پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کہ نشانے پر بیٹھ ہی جاتے تھے۔ کمر بھی لچک دار نہ تھی۔ خاصی کٹھلا سی تھی۔ جھوٹن کھا کھا کر دنبہ ہو رہی تھی۔ چوڑے بھینس کے سے کھر۔ جدھر سے نکل جاتی۔ کڑوے تیل کی سڑاند چھوڑ جاتی۔ ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی۔ تیج تیوہار پر لہک کر کجریاں گاتی تو اس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چلی جاتی۔

بڑھیا مہترانی یعنی اس کی ساس بیٹے کے جاتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہو گئی۔ بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی اس پر نظر رکھنے کیلئے پیچھے پیچھے پھرتی۔ مگر بڑھیا اب لوٹ چکی تھی۔ چالیس برس میلا ڈھونے سے اس کی کمر مستقل طور پر ایک طرف لچک کر وہیں ختم ہو گئی تھی۔ ہماری پرانی مہترانی یعنی ہم لوگوں کے آنول نال اسی نے گاڑے تھے۔ جونہی اماں کے درد لگتے مہترانی دہلیز پر آ کر بیٹھ جاتی اور بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہایت مفید ہدایتیں دیتی بلائیات کو دفع کرنے کے لئے کچھ منتر، تعویذ بھی لا کر پٹی سے باندھ دیتی مہترانی کی گھر میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی۔ چپراسن اور باورچن کی تو اور بات تھی۔ ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا۔ اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی جس میں اُسکے میاں ہوتے تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے بچے کے منہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن ان کے شوہروں پر ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی۔ بس ایک مرکھنا لمبے سینگوں والا بجار تھا کہ چھوٹا پھرتا تھا۔ لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑلی تو شاگرد پیشے کی چھیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد اماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور شور سے خطرہ اور اس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی۔ پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں سب بھاوجوں نے شدومد سے ووٹ دیئے اور اماں کو صدر اعزازی کا عہدہ سونپا گیا، ساری خواتین حسب مراتب زمین، پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پر بیٹھیں۔ پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو بلایا گیا۔ نہایت اطمینان سے بچوں کے منہ میں دودھ دے کر سبھا میں خاموشی قائم کی گئی، اور مقدمہ پیش ہوا۔

"کیوں ری چڑیل، تو نے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہماری چھاتیوں پہ کودوں دلے۔ ارادہ کیا ہے تیرا، کیا منہ کالا کرائے گی؟"

مہترانی تو بھری ہی بیٹھی تھی، پھوٹ پڑی — "کیا کروں بیگم صاحب حرام کھور کو چار چوٹ کی مار بھی دئی مے تو۔ روٹی بھی کھانے کو نا دئی۔ پر رانڈ

میرے تو بس کی نہیں ۔"

"اے رنڈی کی کیا کمی ہے اُسے ۔" باورچن نے اینٹا پھینکا۔ سہارن پور کی خاندانی باورچن اور پھر تیسری بیوی ۔ کیا تیہا تھا کہ اللہ کی پناہ ۔ پھر چپڑاسن ٹالن اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا ۔ بیچاری مہترانی بیٹھی سب کی لتاڑ سنتی اور اپنی خارش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی ۔

" بیگم صاحب آپ جیسی بتاؤ ویسے کرنے سے موئے ناکھوڑی پر کا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیوں ۔"

ٹینٹوا دبنے کے حسین خیال سے ہیلاؤں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور سب کو بڑھیا سے بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی ۔

اماں نے رائے دی ۔۔" موئی کو میکے پھنکوا دے ۔"

"اے بیگم صاحب ! کہیں ایسا ہو سکے ہے ؟" مہترانی نے بتایا کہ بہو مفت ہاتھ نہیں آتی ہے ۔ ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں تب مسٹنڈی ہاتھ آئی ہے ۔ اتنے پیسوں میں تو دو گائیں آ جاتیں ۔ مزے سے کھر کلسی دودھ دیتیں ۔ پر یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے اگر اسے میکے بھیجدیا گیا تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دیگا ۔ بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں دو ہاتھوں والی ہے پر چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے ۔ رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کیا سنبھلتا ۔ یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے ۔

ہیلائیں کوئی ناسمجھ نہ تھیں ۔ معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات

پر آ گیا تھا۔ واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لیئے لازمی تھا۔ دو سو روپلے کا مال کس کا دل ہے کہ پھینک دے۔ ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جو بنئے سے لے کر خرچ کیا تھا۔ جہمان کھلائے تھے۔ برادری کو راضی کیا تھا۔ یہ سارا خرچہ کہاں سے آئیگا۔ رام اوتار کی جو تنخواہ ملتی تھی وہ ساری ادھار میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم میں نہ ملے گی۔ پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار کوٹھیاں نمٹانی ہے۔ رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر بھی اماں نے الٹی میٹم دے دیا۔ کہ " اگر اس لچی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائیگا۔

بڑھیا نے بہت واویلا مچائی اور جاکر بہو کو منہ بھر کر گالیاں دیں۔ جھونٹے پکڑ کر مارا پیٹا بھی۔ بہو اس کی زر خرید تھی۔ پٹتی رہی۔ بڑبڑاتی رہی اور دوسرے دن انتقاماً سارے عملے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی۔ بہشتی، دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی۔ یہاں تک کہ بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھابیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ ہو گئی اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے۔ غرض بہو بھرے بھرے خاندان کے لئے سوئی کا کانٹا بن گئی۔

مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رام رتی اپنی تائی سے ملنے آیا۔ اور پھر وہیں رہ پڑا۔ دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا سو وہ بھی اس نے سنبھال لیا۔ اپنے گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا۔ اس کی بہو ابھی نابالغ تھی۔ اس لئے گونا نہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا جیسے

گھنگھور گھٹائیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہو گئیں۔ بہو کے قہقہے خاموش ہو گئے۔ کانسے کے کڑے گونگے ہو گئے اور جیسے غبارے سے ہوا نکل جائے تو وہ چپ چاپ جھولنے لگتا ہے۔ ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب وہ بجاتے بے نتھے بیل کے نہایت شرمیلی بہو بن گئی۔ جملہ مہیلاؤں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسٹاف کے مردوے اُسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوئی موئی کی طرح لجا جاتی اور زیادہ آنکھ دکھاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھینگی آنکھ کو اور ترچھا کر کے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً بازو کھجلاتا سامنے آکر ڈٹ جاتا۔ بڑھیا پرسکون انداز میں دہلیز پر بیٹھی ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑگڑی پیا کرتی۔ چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا اور وہ عملے کی مرد جاتی پر مشتمل تھا۔ بات بے بات باورچی جو اسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا کونڈی صاف نہ کرنے پر گالیاں دیتا۔ دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رسی پر ڈالتا ہے۔ یہ حرام زادی خاک اڑانے آجاتی ہے۔ چپراسی مردانے میں دس دس مرتبہ جھاڑو دلواتے پھر بھی وہاں کی غلاظت کا رونا روتے رہتے۔ بہشتی جو اس کے ہاتھ دھلانے کے لئے کئی مشکیں لئے تیار رہتا تھا اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتی مگر ٹالتا رہتا۔ تاکہ وہ سوکھی زمین پر جھاڑو دے تو چپراسی گرد اڑانے کے جرم میں اسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سنتی دوسرے

کان اڑا دیتی۔ نہ جانے ساس سے کیا جاکر کہہ دیتی کہ وہ کائیں کائیں کر کے سب کا بھیجا چاٹنے لگتی۔ اب اس کی نظر میں بہو نہایت پارسا اور نیک ہو چکی تھی۔

پھر ایک دن داڑھی والے داروغہ جی جو تمام نوکروں کے سردار تھے اور ابا کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے۔ ابا کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے، اور اس بھیانک بدمعاشی اور غلاظت کا رونا رونے لگے۔ جو بہو اور رتی رام کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی۔ ابا نے معاملہ ستی پسند کر دیا۔ یعنی اماں کو پکڑا دیا۔ جھیلاؤں کی سبھا پھر سے چھڑی اور بڑھیا کو بلا کر اس کے لتے لئے گئے۔

"اری نگوڑی خبر بھی ہے یہ تیری بہو قطامہ کیا گل کھلا رہی ہے؟"

مہترانی نے ایسے چندھرا کر دیکھا جیسے کچھ نہیں سمجھتی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے اور جب اسے صاف صاف بتایا گیا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ دونوں بہت ہی قابلِ اعتراض حالتوں میں پکڑ لے گئے ہیں تو اس پر بڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی۔ بڑا واویلا مچانے لگی۔ کہ رام اوتار ہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا۔ جو اس کی معصوم بہو پر تہمت لگاتے ہیں۔ بہو نگوڑی تو اب چپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے۔ کام کاج بھی جان توڑ کر کرتی ہے۔ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ ٹھٹول بھی نہیں کرتی۔ لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ ماتم کرنے لگی کہ ساری دنیا اس کی جان کی لاگو ہو گئی ہے۔ آخر بڑھیا اور اس کی معصوم بہو

نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے - وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں - وہ تو سب کی رازدار ہے - آج تک اس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا اسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے - کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا - ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کئے ہیں - یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت الٹ دیں - پر نہیں اسے کسی سے بغض نہیں اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اس کا تیہا دیکھ کر فوراً چھری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے ساری مہیلائیں اس کی تریح کرنے لگیں - بہو کچھ بھی کرتی تھی ان کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے تو پھر شکایت کیسی؟ پھر کچھ دن ہوئے بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا - لوگ کچھ بھولنے لگے مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے - بہو کا بھاری بھرکم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا اور لوگ شدومد سے بڑھیا کو سمجھانے لگے - مگر اس نئے موضوع پر بڑھیا بالکل اڑن گھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسے بن جاتی جیسے ایک دم اونچا سننے لگی ہے - اب وہ زیادہ تر کھاٹ پر لیٹی بہو اور رتی رام پر حکم چلایا کرتی - کبھی کھانستی جھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی تو وہ دونوں اس کی ایسی دیکھ ریکھ کرتے جیسے وہ کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیویوں نے اسے بہت سمجھایا - رتی رام کا منہ کالا کر اور اس سے پہلے کہ رام اوتار لوٹ کر آئے - بہو کا علاج کروا ڈال - وہ خود اس فن میں ماہر تھی دو دن میں صفائی ہو سکتی تھی - مگر بڑھیا نے کچھ سمجھ کر ہی نہ دیا - بالکل ادھر ادھر کی

شکایتیں کرنے لگی کہ اس کے گھٹنوں میں پہلے سے زیادہ اینٹھن ہوتی ہے نیز کوٹھیوں میں لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی رہتے ہیں۔ اس کی ٹال مٹول پر ناصحین جل کر مرنڈ ہو گئے۔ مانا کہ بہو عورت ذات ہے، نادان ہے، بھولی۔ بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی ہے لیکن ان کی اعلیٰ خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ پر نہ جانے یہ بڑھیا کیوں سٹھیا گئی تھی۔ جس بلا کو وہ بڑی آسانی سے کوٹھی کے کوڑے کی تہہ میں دفن کر سکتی تھی اُسے آنکھیں میچے پلنے دے رہی تھی۔

رام اتروا کے آنے کا انتظار تھا۔ ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی۔

"آن دے رام اتروا کا کہاں گی۔ توری ہڈی پسلی ایک کر دیہئے ہے۔"

اور اب رام اتروا لام سے زندہ واپس آرہا تھا۔ فضا نے سانس روک لی تھی لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی۔ جب بہو نے لونڈا جنا۔ بجائے اُسے زہر دینے کے بڑھیا کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ رام اونار کے جانے کے دو سال بعد پوتا ہونے پر قطعی متعجب نہ تھی گھر گھر پھٹے پرانے کپڑے، اور بدھائی سمیٹتی پھری اس کا بھلا چاہنے والوں نے اسے حساب لگا کر بہتیرا سمجھایا کہ یہ لونڈا رام اونار کا ہو ہی نہیں سکتا مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا۔ اس کا کہنا تھا۔ اساڑھ میں رام اونار لام پہ گیا۔ جب بڑھیا بیلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے مہینے میں سنڈاس میں گر پڑی تھی۔ اب جیٹھ لگ رہا ہے اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لو لگی تھی مگر بال بال بچ گئی تھی۔ جبھی سے

اس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا — " ویدجی پورے حرامی ہیں۔ دوائیں کھریلا کر دیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ بالکل اصل سوال سے ہٹ کر خیلاؤں کی طرح اول فول بکنے لگتی۔ کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا کہ وہ بات اس کائیاں بڑھیا کو سمجھاتا جسے نہ سمجھنے کا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اس نے رام اوتار کو چھٹی لکھوائی۔

" رام اوتار کو بعد چگا پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں اور تمھاری کشلتا بھگوان سے نیک چاہتے ہیں اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے سو تم اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آجاؤ۔"

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا مگر سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لئے موزے اور بنیان لا رہا ہے۔ جنگ ختم ہو گئی اور اب بس وہ آنے ہی والا تھا۔ بڑھیا پوتے کو گھٹنے پر لٹائے کھاٹ پر بیٹھی راج کیا کرتی۔ بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا کہ ساری کوٹھیوں کا کام ترت پھرت ہو رہا ہو مہاجن کا سود پابندی سے چک رہا ہو اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر لوگوں نے سوچا، رام اوتار آئے گا۔ اصلیت معلوم ہوگی تب دیکھ لیا جائیگا اور اب رام اوتار جنگ جیت کر آ رہا تھا۔ آخر کو سپاہی ہے کیوں نہ خون کھولے گا۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ شاگرد پیشے کی فضا جو بہو کی تو تا چشمی کی وجہ سے سو گئی تھی۔ دو چار خون ہونے اور ناکیں کٹنے کی آس میں جاگ اٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہوگا۔ جب رام اوتار لوٹا۔ شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی

باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تاکہ اطمینان سے مچیٹے کا لطف اٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اتار کر منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنوئیں کے پاس پٹک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اسکی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا جیسے وہی اس کا باپ ہو جھٹ پٹ اس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کر دیا۔ لوگ سمجھے کھکری یا چاقو نکال رہا ہے۔ مگر جب اس نے اس میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے عملے کی قوت مردانہ پر ضرب کاری لگی ــ ہت تیرے کی، سالا سپاہی بنتا ہے ہیجڑا، زمانے بھر کا۔

اور بہو۔ سمٹی سمٹائی جیسے نئی نویلی دلہن۔ کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے بدبو دار فوجی بوٹ اتارے اور چرن دھو کر پیئے۔

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا۔ پھبتیاں کسیں "اسے گاؤدی کہا۔ مگر وہ گاؤدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو۔ رتی رام کا گونا ہونے والا تھا، سو وہ چلا گیا۔

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا۔ ہمارے ابا جو عام طور پر نوکروں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے وہ بھی جز بز ہو گئے۔ اپنی ساری قانون دانی کا داؤ لگا کر رام اوتار کو قائل کرنے پر تُل گئے۔

"کیوں بے تو تین سال بعد لوٹا ہے نا؟"

"معلوم نہیں حجور، تھوڑا کم جیادہ ...... اتنا ہی رہا ہوگا"۔

"اور تیرا لونڈا سال بھر کا ہے

"اتنا ہی لگے ہے سرکار، پر بڑا بدماس ہے سسر" رام اوتار شرمائے۔

"ابے تو حساب لگا لے"۔

"حساب ؟..... کیا لگاوں سرکار"۔ رام اوتار نے مرگھلی آواز میں کہا۔

"اُلو کے پٹھے یہ کیسے ہوا؟"

"اب جے میں کا جانوں سرکار..... بھگوان کی دین ہے"۔

"بھگوان کی دین! تیرا سر..... یہ لونڈا تیرا نہیں ہو سکتا۔

ابّا نے اسے چاروں اور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا۔ کہ لونڈا حرامی ہے تو وہ کچھ کچھ قائل سا ہو گیا۔ پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

"تو اب کا کروں سرکار — حرامجادی کو میں نے بڑی مار دی۔ وہ غصے سے بپھر کر بولا۔

"ابے نرا الو کا پٹھا ہے تو..... نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو"۔

"نہیں سرکار، کہیں ایسا ہو تے سکے ہے"۔ رام اوتار گھگھیانے لگا۔

"کیوں بے؟"

"حجور، ڈھائی تین سو پھر سگائی کے لئے کاں سے لاؤں گا اور برادری جمانے میں سو دو سو الگ کھرچ ہو جائیں گے"۔

"کیوں بے، تجھے برادری کیوں کھلانی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان

تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا۔؟"

"جے ہیں نہ جانوں سرکار۔ ہمارے میں ایسا ہوئے ہے"

"مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار..... اس حرامی رتی رام کا ہے" ابّا نے عاجز آکر سمجھایا۔

"تو کا ہوا سرکار..... میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام۔ کوئی غیر نہیں، اپنا ہی لہو ہے"

"بڑا الّو کا پٹھا ہے" ابا بھنا اٹھے۔

"سرکار، لونڈا بڑا ہو جاوے گا اپنا کام سمیٹے گا" رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا "وہ دو ہاتھ لگائے گا، سو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا" ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں، ایک دم رام اوتار کے ساتھ ساتھ ابا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے..... یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں اس کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے ننھے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

یار

جب اکبر نے فریدہ کو ریاض سے ملایا تو ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ریاض معصوم صورت خاموش سا لڑکا تھا۔

"ہم دونوں ایک ہی گلی میں کھیلے۔ گیّل اور کبڈی کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ اتفاق سے کالج میں بھی ساتھ نہ چھوٹا۔ پھر یہ بھی بمبئی آ گیا۔ کتنا عجیب اتفاق ہے"۔ اکبر نے کہا تھا۔ "ذرا بورنگ سا انسان ہے"۔ یہ جملہ بھی ساتھ لگا دیا تھا۔

شروع شروع میں عموماً تینوں ساتھ ساتھ رہتے۔ سینما کے تین ٹکٹ خریدے جاتے۔ ہوٹل میں تین سیٹیں ریزرو ہوتیں۔ ریاض کا وجود کچھ لازم و ملزوم سا ہو گیا تھا۔ پھر جوں جوں شادی پرانی ہوتی گئی اور اکبر کی مصروفیتیں بڑھتی گئیں۔ فریدہ اور ریاض کا ساتھ بھی بڑھتا گیا۔ اکبر تو نئے دوستوں اور نئے مشغلوں میں ڈوب کر دیر سے آتے۔ ریاض سیدھا دفتر سے

آجاتا۔ چائے پی کر اخبار یا میگزین دیکھا کرتا۔ کبھی دونوں کیرم یا تاش کھیلنے لگتے۔ کبھی کسی سہیلی سے ملنے جاتی اور اکبر کو دیر ہو جاتی تو وہ ریاض کو لے جاتی۔ اکبر تو کبھی عورتوں کی غیر دلچسپ باتوں سے گھبرا کر چل بھی دیتا۔
"تم ریاض کے ساتھ لوٹ آنا۔"

اور وہ ریاض کے ساتھ لوٹ آتی۔

شادی پرانی ہوتی گئی۔ مگر ریاض کی اہمیت دن بدن بڑھتی گئی۔ فریدہ نے انجانے طور پر سارے شوہروں والے اوپری کام ریاض سے لینے شروع کر دیئے ـــــ نوکروں کی مرمت کرنا، راشن کارڈ بنوانا۔ شاپنگ کے لئے ساتھ ساتھ دھکے کھاتے پھرنا۔ چھوٹے موٹے خط لکھنا۔ بینک میں روپیہ جمع کرانا، نکلوانا اور مختلف کام کرنا۔

یہاں تک کہ جب فریدہ کا "مس کیرج" ہوا۔ تو خوش قسمتی سے ریاض دفتر میں مل گیا۔ اسی نے آکر ہسپتال پہنچایا۔ اس دن اکبر کے کسی افسر کی الوداعی پارٹی تھی۔ جب وہ وہاں سے رات کو دو بجے گھر پہنچے اور بیگم کی بدحالی کا پتہ چلا تو ظاہر ہے بہت گھبرائے۔ مگر صبح کا انتظار کرنا پڑا افسر کو سٹیشن پر رخصت کر کے، جب وہ ہسپتال پہنچے تو اجاڑ صورت ریاض کو دیکھ کر ان کا بھی رنگ اڑ گیا۔ وہ ساری رات بنچ پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ اکبر نے اسے زبردستی آرام کرنے کے لئے بھیجا۔

انہیں ہسپتال روز جانے کی فرصت نہ تھی۔ اس لئے وہ ریاض ہی کو فون کر کے دوائیں وغیرہ خریدنے کی ہدایت دے دیتے۔ حسن اتفاق کہیئے۔ یا

قسمت۔ جب وہ اچھی ہوگئی اور وہ اُسے ہسپتال سے گھر لانے موٹر لے کر گئے تو معلوم ہوا کہ وہ صبح ہی ریاض کے ساتھ گھر آ چکی تھی۔ ریاض نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ دن بھر کے بعد جب اکبر دفتر سے لوٹے تو ریاض گھر سنبھالے ہوئے تھا۔

پھر دن گزرتے گئے۔ اکبر کی بے توجہی اور غیر دلچسپی نے اور بھی ذمہ داریاں ریاض کے کاندھوں پر ڈال دیں۔ وہ ابھی تک چھڑا تھا۔ دو ایک جگہ لوگوں نے شادی کرانے کی کوشش کی، مگر وہ ٹالتا رہا۔ "بھئی مجھے خانہ داری کے جھگڑوں سے وحشت ہوتی ہے۔"

وہ کہہ کر ٹال دیتا، اور بات بھی خدا لگتی تھی۔ اکبر تو اسے ہمیشہ یہی نصیحت کرتے "میاں اس چکر میں نہ پھنسنا، کسی کام کے نہیں رہوگے۔ اپنی جوگت ہے۔ وہ دیکھ ہی رہے ہو۔ شادی وبال ہے۔"

پھر بال بچے ہوئے۔ اکبر تو بچوں کی چل پوں سے گھبرا کر کلب چلے جاتے یا کسی یار دوست کے یہاں پینے پلانے کا پروگرام رہتا۔ ریاض دفتر سے سیدھے ان کے گھر جاتے۔ بچوں سے کھیلا کرتے، روتے بچوں کو شہد چٹا دیا۔ گرائپ واٹر دے دیا۔ فریدہ کو الٹے سیدھے کام لینے میں بہت مزہ آتا۔ وہ بے تکے پنے سے بچے کا نیپکن بدلتا یا نہلاتے میں پانی ڈالتا تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ جاتی۔ پہلے تو اُسے بڑی گھبراہٹ ہوتی۔ سر سے پیر تک بھیگ جاتا۔ لیکن فریدہ منع کرتی تو کہتا۔ "کوئی بات نہیں"

"اچھا ہے تم یہ کام سیکھ لو۔ تمہاری بیوی مزے کرے گی۔" وہ ہنستی

اور ریاض بھی ہنس دیتا۔ کبھی کوئی بچہ بے بات رونے لگتا۔ فریدہ کسی دوسرے کام میں مشغول ہوتی تو وہ ریاض کو ڈانٹتی "اے ہے کیسے بے ہودہ آدمی ہو، بچہ رو رہا ہے۔ ذرا چپ کرا دونا"

"اُلو کی اولاد چپ ہی نہیں ہوتا"

"تو لوٹے ہاتھوں سے اٹھایا نہیں جاتا"

اور وہ بچے کو اٹھا کر لیسے بہلانے کے لئے عجیب بندروں کی سی حرکتیں کرتا۔ بچہ بہل جاتا۔

جوں جوں بچے بڑھے۔ ریاض کی ذمہ داریاں بھی بڑھیں۔ بچوں کا کس اسکول میں داخلہ کرایا جائے۔ اون ریاض کے ایک دوست کے ذریعہ سستا مل سکتا ہے۔ شکر بلیک سے لینی ہو تو فریدہ اور فریدہ کی ساری سہیلیوں کے لئے ریاض مہیا کرے۔ خود اکبر ان کاموں سے جی چراتے تھے۔ کبھی کوئی ایسا فلم آتا۔ جس سے اکبر کو دلچسپی نہ ہوتی تو وہ خود کہہ دیتے۔ "بھئی تم ریاض کے ساتھ دیکھ آؤ مجھے ایسے فلموں سے دلچسپی نہیں"

اکبر کی دلچسپیاں بہت کچھ پینے پلانے کے گرد محدود ہوتی جا رہی تھیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں ریاض رات کا کھانا بھی یہیں کھانے لگے فریدہ ان کے ساتھ بچوں کو سیر کراتی۔ سرکس دکھاتی۔ شام کو دونوں مل کر بچوں کیساتھ کھیلتے۔ پھر بہلا پھسلا کر کپڑے بدلا کر سلا دیتے۔ اکبر کو ان جھگڑوں کے لئے فرصت نہ تھی۔ بچے بھی باپ سے بے تکلف نہ تھے۔ ریاض کے کندھوں پر چڑھ کر "انکل انکل" کر کے پیسے مانگتے۔ نئی نئی فرمائشیں کرتے۔ اکبر تو

فریدہ کو گھر کا خرچ دے دیتے تھے۔ انہیں تحفے دینے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بچے بھی جان گئے تھے۔

آندھی آئے، پانی برسے۔ ریاض کا آنا ناغہ نہ ہوتا۔ اگر کسی وجہ سے وہ کسی دن نہ آپاتے تو سارا گھر پریشان ہو جاتا۔ فریدہ بوکھلائی ہوئی پھرتیں۔ سارے پروگرام الٹ جاتے۔ خدا جانے ریاض کو کیا ہو گا۔ بیمار تو نہیں پڑ گئے کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا؟ کبھی نوکر دوڑاتیں، کبھی پڑوس میں ٹیلیفون کرتیں۔ اگر بدقسمتی سے ریاض کسی دوست کے ساتھ سینما دیکھنے چلا گیا ہوتا۔ تو دوسرے دن اس کی شامت آجاتی۔

"کہاں مر گیا تھا، ذلیل مجھے فون ہی کر دیا ہوتا تو میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔ فلم کے ٹکٹ منگائے تھے۔ بڑی مشکل سے واپس ہوئے نہ ہوتے تو تمہیں پیسے بھرنا ہوتے۔"

بچے بھی پیچھے پڑ جاتے۔ "ہم آپ سے نہیں بولتے۔ آپ کل آئے کیوں نہیں؟" جرمانے وصول کرکے طلب ہونا اور وہ نہایت پابندی سے آنے لگتے۔

اگر کبھی ریاض کی طبیعت خراب ہو جاتی تو فریدہ بچوں کو لے کر، ان کے گھر دھاوا بول دیتیں۔ تیمارداری کم، خود اپنی خاطر زیادہ کرواتیں۔ ان جھگڑوں سے جان چھڑانے کے لئے ریاض بیمار ہوتے ہی ان کے گھر آن پڑتے اور پھر ایسا ہی ہونے لگا۔ کہ اگر کسی دن غلطی سے اکبر دفتر سے سیدھے گھر آجاتے تو بچے اور بیوی گھبرا جاتے کہ ان پر یہ کیا مصیبت ٹوٹ

پڑی ہے۔ جو یوں آن پڑا۔ فریدہ اور ریاض کا پروگرام لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ سینما کے دو ٹکٹ ہوتے تو پھر تیسرا کہیں الگ ملتا اور "تکلفاً" ریاض کو الگ بیٹھنا پڑتا۔ مارے شرمندگی کے مزا کرکرا ہوجاتا کہ روز تو اس کو وہ جہاں چاہے گھسیٹ لے جاتی ہے۔ ایک دن شوہر نامدار بھاند پڑیں تو اس غریب کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا جائے

کھانے پر بھی گڑبڑ مچ جاتی۔ عموماً اکبر کے لئے میز پر پلیٹ لگائی ہی نہیں جاتی تھی۔ رات کو دو ڈھائی بجے پی کر آتے تو اپنے کمرے ہی میں کھانے کی ٹرے منگوا لیا کرتے تھے۔ جس دن وہ جلدی آجاتے تو ایسا معلوم ہوتا۔ کوئی مہمان بے وقت ٹپک پڑا ہو۔ جلدی جلدی ان کیلئے جگہ بنائی جاتی۔ ریاض جو عموماً فریدہ کے قریب ہی بیٹھا کرتا تھا تاکہ بچوں کو کھانا دینے میں مدد دی جائے۔ آخری کرسی پر دور جا بیٹھتا۔ بچے حیرت سے اس تبدیلی کو دیکھتے۔ فریدہ کو بڑی کوفت ہوتی کیوں کہ اکبر بالکل اجنبیوں کی طرح کھاتے رہتے۔ فریدہ کو اکیلے ہی بچوں کو سنبھالنا پڑتا۔ اگر اکبر کچھ مدد کرنے کی کوشش بھی کرتے تو بدمزگی پیدا ہوجاتی۔

"ارے، ارے، یہ اتنے چاول اس کی پلیٹ میں بھر دیئے۔ مارو گے کمبخت کو؟ یوں بھی اسے کھانسی ہے۔ دہی نہ دو۔ ارے یہ چٹنی تو بچوں کی تھی۔ تم نے ختم کر دی اور اکبر مجرم رہ جاتے۔

ریاض بیٹھے بیٹھے خود ٹھونس رہے ہو، اتنا نہیں ہوتا کہ بچوں کو بھی دے دو۔ میرے دو ہاتھ ہیں۔ کیا کیا کروں؟ وہ ڈانٹتی اور ذرا سی دیر

میں ریاض پوری میز کا چارج لے لیتا۔ نہایت حساب کتاب سے وہ
کھانا تقسیم کر دیتا۔ کسے کون سی بوٹی پسند ہے۔ آج کس کی گودے
کی ہڈی کی باری ہے۔ گردہ کسے ملے گا۔ کسے رانٹہ ملے گا کسے سوپ
پھر کسی کو ڈرانا ہے۔ کسی کو پھسلانا ہے۔ کون ذراسی ڈانٹ دے دی
تو ساری میز لوٹ پوٹ کر ڈالے گا۔ کون ڈانٹ کے بغیر بھوکا بسورتا رہ
جائے گا۔

پھر وہ لطیفے، چٹکلے۔ روٹی کی کہانی — بوٹی کا قصہ — مرچوں
کے چٹپٹے واقعے — اکبر کو کیا معلوم ؟ وہ تو ریاض کو ہی ازبر تھے۔ وہ
ان کے نجی مذاق جو باہر والے کی سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے — اور اکبر
باہر والے تھے۔ لومڑی کی دعوت میں سارس کی طرح حونق اور اکتائے
ہوئے کھانا زہر مار کرتے رہتے۔

اکبر دلی نہیں جا سکتے تھے۔ چھٹیاں تو تھیں مگر ان دنوں کرکٹ میچ
ہو رہے تھے۔ اور وہ میچ کے دیوانے تھے۔ کبھی ریاض بھی ان میچوں
کا دیوانہ تھا۔ مگر چوں کہ فریدہ کو اُن سے وحشت ہوتی تھی۔ اس نے کہہ
کہہ کر دلچسپی چھڑا دی۔ میچ آتے تو اُسے ایسا معلوم ہوتا اس کی جان پر
سوتن آ گئی۔ اس لیے اس نے عجیب و غریب چالیں چل کر ریاض سے
یہ میچ چھڑائے۔ وہ ان دنوں پکنکوں کے پروگرام بنا لیتی۔ سینما کے
ٹکٹ خرید لیتی۔ بغیر محسوس کیے ریاض کی دلچسپی ختم ہو گئی ہاں سوئمنگ

کا شوق قائم رہا۔ حالانکہ فریدہ کو پانی سے ڈر لگتا تھا۔ مگر وہ بچوں کے ساتھ جاتی۔ ریاض بچوں کو تیرنا سکھایا کرتا اور وہ کنارے بیٹھی سوئیٹر بُنا کرتی۔

شروع شروع میں اس نے اکبر کے لئے سوئٹر بُنے۔ مگر انہوں نے وہ سوئٹر خاص طور پر ان دوستوں کو دیئے۔ جو فریدہ کو زہر لگتے تھے۔ ریاض کے پاس بیس بیس برس کی پرانی چیزیں سینتی رکھی تھیں ہر سال وہ ایک نئے سوئٹر کے ساتھ پرانے سوئٹر کی بھی مرمت کر دیتی۔
اس کے باوجود اکبر اور فریدہ میاں بیوی تھے۔ ان کے بچے بیدار ہو رہے تھے۔ وہ ایک ہی گھر میں، ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ان کے پلنگوں کے درمیان صرف ڈھائی فٹ کا فاصلہ تھا۔ ظاہر ہے بچوں کو لے کر فریدہ کے اکیلے دہلی جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا —— مجبوراً ریاض کا بھی ٹکٹ خریدا گیا۔

فریدہ اپنے بھائی کے گھر ہی ٹھہریں۔ بھائی بھابھی میرٹھ کسی دوست کی شادی میں گئے ہوئے تھے، اپنے دونوں بچوں کو چھوڑ گئے تھے۔ دہلی میں خوب مزے کئے۔ خوب سیریں کیں۔ پچھلی مرتبہ اکبر کے ساتھ آنا ہوا تھا۔ انہیں باہر جانے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ہوٹل میں ٹھہرے تھے سرِ شام ہی سے لوگ "شغل" کے لئے جمع ہو جاتے۔ بڑی چہل پہل رہتی۔ مگر بچے ساتھ نہیں تھے۔ وہ انہیں ریاض کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بالکل نئے سرے سے ہنی مون کا لطف آ گیا تھا۔ مگر کبھی کبھی بچوں کی یاد آکر

مزہ کرکرا کر دیتی ـــــ بچوں کو جو ریاض کی نگرانی میں چھوڑ گئی تھی ۔ مگر اب تو کچھ عادت سی پڑ چکی تھی ۔

ریاض نے خوب سیریں کرائیں ۔ تصویریں کھینچیں ، فریدہ کی اور بچوں کی ہنستی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی ۔ کبھی فریدہ کہتی ـــــ " ریاض تم بھی تو آؤ ـــ کسی سے کہو بٹن دبا دے ۔"

اور ریاض بھی فریدہ کے قریب آجاتا ـــ آس پاس بچے ہوتے ۔

بھائی کے بچے منو اور شہنہ جو پہلی مرتبہ فریدہ کے بچوں سے ملے تھے ریاض کو انکل کہتے اور بڑے گھل مل گئے ۔ مگر ایک دن شہنہ نے بڑے تعجب سے پوچھا ۔ " تم اپنے ڈیڈی کو انکل کیوں کہتے ہو ؟"

" کسے ؟"

" انکل ریاض کو ـــ "

" سِلّی ـــــ انکل ریاض ہمارے انکل ہیں ۔"

" اچھا ؟ یہ تمہارے ڈیڈی نہیں ـــ ؟" شہنہ نے معصومیت سے پوچھا ۔
اور بچوں نے خوب اُس کا مذاق اُڑایا ۔" انکل یہ آپ کو ہمارا ڈیڈی سمجھتی ہیں ، اُلو کہیں کی ۔"

ریاض کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا ۔ فریدہ کو بھی ہنسی آگئی ۔

" تو کیا تو میری بیٹی نہیں ؟ ـــــ ؟" ریاض نے کہا ۔

" مگر ـــــ " بچی کی سمجھ میں نہ آیا اپنا مطلب کیسے واضح کرے ۔

" جا بھنگن تو میری بیٹی نہیں ـــــ اب مانگنا چچا کو لیٹ ۔"

"اوں ۔۔ بیٹھی ہوں آپ کی ۔۔" بچی اس کے گلے سے جھول گئی۔

فریدہ کی سہیلی نے دعوت کی۔ بچوں کا کیا کیا جائے۔

"کل الا بلا کھانے سے گلے میں درد ہو رہا ہے ۔۔ تم چلی جاؤ میں بچوں کو دیکھ لوں گا ۔۔" ریاض نے سر کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ فریدہ خوشی خوشی تیار ہوئی مگر جانے سے پہلے اسے غرارے کیلئے پانی دیا۔ پنسلین کی گولیاں چوسنے کی ہدایت کی، بچوں کے بارے میں احکامات جاری کئے اور بن سنور کر جانے لگی۔

"اُفوہ ۔۔ تمہاری اس یرقان زدہ ساڑھی سے بڑی وحشت ہوتی ہے قسم خدا کی ایک دن اسے جلا دوں گا۔" ریاض نے پلنگ پر لیٹے لیٹے پکارا۔

"اونھ آپ کون ہوئے ۔۔۔" اس نے ٹالنا چاہا۔ مگر قدِ آدم آئینہ میں دیکھا تو ایسا لگا ریاض ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ساڑھی بدل ڈالی۔

پارٹی شاندار رہی۔ سب نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔ یہ بتاتے ہوئے اسے کچھ ہتک محسوس ہوئی کہ وہ بیچ کی وجہ سے نہیں آئے کسی کو کچھ بتایا، کسی کو کچھ۔ بات ٹال دی۔

"بچوں کو ریاض پر چھوڑ آئی ہوں، پریشان کر رہے ہوں گے۔" سہیلی نے روکا تو فریدہ نے کہا۔

"بھئی آپ خوب ہیں ۔۔ میاں سے بچے بلواتی ہیں۔" سہیلی کے میاں نے شکایت کی۔

"مگر میرے میاں تو بمبئی میں ہیں۔"

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بچے ریاض پر چھوڑ آئی ہوں؟"

"ہائے ہے ڈارلنگ —— ہاؤ سلی۔ زینی کے ہسبینڈ کا نام تو اکبر ہے"

سہیلی نے بات صاف کی۔

"اوہ —— اور ریاض ——؟"

"اکبر کے بچپن کے دوست بلکہ بھائی ہی سمجھئے"

"بلکہ اکبر ہی سمجھ لیجئے تو کیا حرج ہے؟" زوردار قہقہہ پڑا۔

فریدہ کو ذرا کوفت ہوئی۔ کتنے چیپ ہیں یہ لوگ —— اُنھ لعنت! انہیں کون سمجھائے۔ کئی بار لوگوں نے غلطی سے ریاض کو اس کا شوہر سمجھ لیا اسے بُرا نہ لگا۔ ضرور وہ لوگ نہایت احمق سے لگے۔ اُنھ کیا ہونا ہے ان باتوں سے۔ کیا بگڑتا ہے۔ مگر بات زیادہ سفوتی نہ معلوم ہوئی تو اس کی سہیلی نے کہا "ریاض کی شادی زینت سے کیوں نہیں کروا دیتیں؟"

"ارے بھئی کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کمبخت سے۔ سنتا ہی نہیں، مذاق میں ٹال دیتا ہے"

"تم کہو تو ضرور مانے گا ——"

"تو تمہارا مطلب ہے میں نے اس سے نہیں کہا" فریدہ جلی۔

"نہیں ذرا زور ڈالو"

"میں کیسے زور ڈالوں —— کوئی بچہ ہے کہ پچھاڑ کر دوا پلا دوں" وہ اور بگڑی۔

"ہائے ہے، اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے"

"میں تو خاک نہیں بگڑتی ——" فریدہ نے بہت ہی بگڑ کر کہا۔
"اچھا جانے دو۔" سہیلی اپنی جان چھڑا کر بھاگی۔ فریدہ کھسیانی رہ گئی۔ لوگ سمجھتے ہیں وہ ریاض کی شادی نہیں ہونے دیتی۔ اسے ریاض پر غصہ آنے لگا۔ اس نے کتنی بار کہا کہ کمبخت شادی کیوں نہیں کرتا۔ ہمیشہ ٹال دیتا ہے

"ارے ہٹاؤ ——"

"کیا جاہلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔"

"بھئی میں جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔" اور وہ بچوں کے ساتھ ادھم مچانے لگتا یا ڈانٹ کر ان کا ہوم ورک کروانے لگتا۔ ان کی رپورٹ پر غور کرنا۔ استادوں سے ملنا یہ بے چارے اکبر کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بے دیکھے دستخط کر دیتے اور کہہ دیتے۔

"ریاض سے کہو اچھی طرح دیکھ لے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

ایک دن ریاض بڑے غصہ میں باہر سے آیا اور فریدہ کو ڈانٹنا شروع کیا۔ "کچھ ہوش بھی ہے صاحب زادی ابھی سے پیر نکال رہی ہیں —— نہ جانے کن لونڈوں کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ میرا تو قسم خدا کی خون کھول گیا۔"

"میرا تو کہنا ہی نہیں مانتی ——" فریدہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

"نہیں مانتی تو ٹھوکو چڑیل کو۔ نہیں تو میں ٹھوکوں گا۔"

"مار پیٹ سے کیا ہوگا ——؟" پھر دونوں گھنٹوں بچوں کی نفسیات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہے۔ دونوں میں سے کسی

کو خیال بھی نہ آیا کہ اس معاملہ میں اکبر کی رائے بھی لی جائے۔ کیا فائدہ' بے کار پریشان ہو جائیں گے۔ ان کی شراب نوشی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ذرا سی بات پر بہت ہی پریشان ہو جاتے تھے اور پھر سب کی زندگی حرام ہونے لگتی تھی

دہلی کی سیر ہو چکی تھی۔ بچوں کی چھٹیاں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ فریدہ کو بھائی بھاوج کا انتظار تھا کہ آجائیں تو ان سے مل کر جائے۔

"اکبر نہیں آئے ـــــ؟" اُنھوں نے آتے ہی حیرت سے پوچھا۔

"اُنہیں کچھ کام تھا ـــــ" فریدہ صفا جھوٹ بول گئی۔

"اور یہ باہر کمرے میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟"

"ریاض" فریدہ نے لاپرواہی سے کہا۔ مگر اسے ڈر لگنے لگا۔

"ریاض ـــــ یعنی وہ تمہارے ساتھ یہاں بھی آیا ہے؟"

"ہاں ـــــ مگر ـــــ" فریدہ اُن کے لہجہ سے چونکی۔

"میں ان حرکتوں کو قطعی پسند نہیں کرتا" ـــــ "وہ غرّائے۔

"اے ہے جانے بھی دیجئے" بھابی نے سمجھایا "باہر آواز جائے گی"

"آواز جائے گی تو جانے دو۔ میں کسی حلال زادے سے ڈرتا ہوں؟ شرم نہیں آتی ـــــ اب تو بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ تمہارے یہ گُن دیکھ کر وہ کیا سیکھے گی۔ تم اکبر کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ مگر مجھے اُلّو نہیں بنا سکتیں ـــــ دنیا تمہارے منہ میں تھوک رہی ہے"

"جہنم میں تھوک رہی ہے؟" فریدہ نے سوچا۔

"اکبر جیسا بے شرم انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیا اسے کچھ نظر نہیں آتا؟"

"کیا نظر نہیں آتا — ؟ فریدہ نے اور سوچا۔

"مگر تمھاری یہ ہمت کہ تم میرے گھر میں غلاظت پھیلا رہی ہو —"

"غلاظت . . . ." سوچتے سوچتے فریدہ کی کنپٹیاں جھنا گئیں۔

"اپنے یار کو ساتھ لئے پھرتی ہو!" بھابی نے بہت روکا۔ مگر وہ کہہ ہی گئے

"یار!" فریدہ کا جی چاہا زور کا قہقہہ لگائے — ریاض اس کا یار ہے۔ مگر ہنسی اس کے گلے میں سسک کر رہ گئی۔ بیس برس زن زن کرتے نظروں میں گھوم گئے — یار! دنیا کی نظروں میں ریاض اس کا یار نہیں تھا، تو پھر کون تھا — ؟ اور وہ چپ چاپ اٹھ کر سامان باندھنے لگی۔

بے کار

اسی روپے تنخواہ، مہنگائی بھتہ، امتحانوں کی فیس ملا جلا کر گذر ہو جاتی تھی۔ کچھ بچتا ہی نہ تھا، مگر قرض ایک مہینے کا دوسرے مہینے میں چکتا ہی چلا جاتا تھا۔ نسیم کی پیدائش میں بھی کھینچ تان کر پورا پڑ جاتا، اگر ہاجرہ کا بخار جان کو نہ لگ گیا ہوتا تو جھمکیوں کو بیچنے کی نوبت نہ آتی۔ کس ارمان سے جھمکیاں بنوائی تھیں! بڑا دکھ ہوا۔ خیر پھر بن جائیں گی۔

مگر یہ سب دل کے بہلاوے کی باتیں ہیں۔ جہیز کی ساری چیزیں ایک بار ختم ہو کر پھر نہ بن سکیں۔ جگنو مہدی کے امتحان کی فیس کی نذر ہو گیا۔ سوچا تھا چلو نوکری تو مستقل ہو جائے گی ہزار جگنو بن جائیں گے۔ ہر مہینے جگنو کا حساب لگتا سونے کی قیمت گھٹنے کا نام ہی نہ لیتی۔ غضب خدا کا۔ اکیس روپے سے ایک سو سولہ پر آ گیا۔ بھلا کیا جگنو بنوائے کوئی۔

اللہ میاں نے ماں کی چھاتیوں میں دودھ بھی شاید باقر میاں جیسوں کی تنخواہ کا اندازہ لگا کے دیا ہے۔ مکان کا کرایہ نہ ہو نہ سہی۔ روکھی سوکھی چل ہی جائے گی۔ پر بچے کا وہی شاندار سامان قدرت نے اپنے ہاتھوں سے سجا دیا۔ مگر بخار

میں کمبخت دودھ بھی سوکھ گیا۔ اماں جی تو یہی کہتی رہیں "بُوا فیشن ہے بوتل سے دودھ پلانے کا۔ ہمارے زمانے میں تین تین سال پلاؤ تب بھی نہیں ختم ہوتا تھا"

پر بھلا اُن سے یہ کون کہتا کہ ہُوا تمہارے زمانے میں ڈالڈا نہیں تھا۔ بھر بھر پیالے اچھوانی سٹو سے اڑاتی تھیں۔ پھر تین سال دودھ پلاتی تھیں تو کون سی توپ چھوڑتی تھیں" مگر بوا کے منہ لگنا اپنی میت اٹھوانا ہے۔ وہ پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑتیں کہ ہوش اڑ جاتے۔ کئی کئی دن بُوا کے طعنے چلا کرتے۔ چلو بات ختم ہوئی، کہہ لیا، سُن لیا، چھُٹی ہوئی۔ مگر بُوا کو اور کام ہی کیا تھا سوائے اپنی گٹھیا کو کوسنے کے۔ گٹھیا کے ساتھ کوئی اور ہاتھ آجاتا، بس اس کو دوہرائیں۔

جب تخفیف میں باقر میاں کا نام آیا تو پہلے تو اسے مذاق سمجھتے رہے۔ نو برس نوکری کی، مستقل نہیں تھے تو کیا ہوا، ہو جائیں گے۔ اپنی سرکار ہے۔ اپنی فکر آپ کرے گی۔ خیر، نوٹس ملا ہے تو کیا ہوا۔ پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ ذرا سی دوڑ دھوپ کے بعد پھر کسی دوسرے اسکول میں لگا دیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چھ مہینے کہیں جگہ خالی نہ تھی تو رجسٹرار کے دفتر ہی میں لگ گئے تھے۔ مطلب تو تنخواہ سے تھا۔ جب تک ملتی رہی خیال بھی نہ آیا کہ عارضی ہیں یا مستقل

پر اب کے تو ایسا پکا جواب ملا کہ ڈیڑھ سال کی دوڑ دھوپ کے بعد معلوم ہوا کہ کسی کے بس کی بات نہیں اور کوئی گنجائش بحالی کی نہیں رہ گئی ہے۔ نو سال مستقل نہ ہونا ہی نکمے پن کا ثبوت تھا۔ ویسے تو ان سے چار ہاتھ اگلے پڑے روٹیاں توڑ رہے تھے

مگر فرق اتنا تھا کہ انہوں نے مستقلی کی کھائی پھاند لی تھی۔ انہوں نے سستی یا لاپروائی کی وجہ سے اس کی کچھ اہمیت ہی نہ سمجھی۔

یہ ڈیڑھ سال کیسے گزرا، یہ ہاجرہ بی جانیں یا باقر میاں یا کچھ اماں جی مگر انہیں تو گیارہ روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ ان کے پان تمباکو اور افیون کو پورا پڑ جاتا تھا۔ کبھی کھانے کے سوا، اوپر سے پیسے کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ مرنے والے نے مر کے بھی اتنا سہارا تو چھوڑا۔

کیسی جھمکیاں اور کیسا گلوبند۔ ایک ایک کر کے تار تار پہلے گروی ہوا۔ پھر بک گیا۔ افسروں کے گھر کی خاک بے ڈالی پر نوکری واپس نہ ملی۔ سال میں چھ مہینے دو ایک ٹیوشن مل جاتے۔ مگر بھری کلاس پڑھانے کے عادی ٹٹروں لٹوں ایک دو بچوں کو پڑھاتے تو کھلا اٹھتے۔

ہاجرہ بی نے پنجاب سے میٹرک کر کے اپنے طبقے کی بیویوں میں کافی قابلِ اعتراض حد تک آزاد ہونے کا رتبہ پا لیا تھا۔ جب شادی ہوئی۔ تو سارا پڑھا لکھا بال بچوں کی دیکھ بھال میں ناک کے رستے نکل گیا برسوں سے کوئی کتاب ہاتھ سے بھی نہیں چھوئی تھی۔ کبھی جی گھبراتا تو دوپہر کو پرانی "سہیلی" کی جلدیں جو میکے سے ملی تھیں پھر پڑھ ڈالتیں۔ ہاجرہ بی کے ابا کو بیٹی کی تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ زنانے پرچے مستقل اس کے نام آتے رہے۔ شادی کے بعد کچھ لاپروائی، کچھ مشغولیت اور کچھ پیسے کی کمی کی وجہ سے رسالے وسالے سب بند ہو گئے۔

جب پڑوسن نے ہاجرہ بی کو پاس کے اسکول میں ٹیوشنی کرنے کی رائے

دی - تو بی اماں نے ان کی سات پشتوں کی قبر میں کیڑے ڈال دیئے پڑھی لکھی عورتوں کے چال چلن کے بارے میں اتنے ڈراؤنے قصے سنائے کہ ہاجرہ نے کان پکڑ لیئے۔ کہ " توبہ میری، میں کہاں کر رہی ہوں نوکری؟ یہ ساری موئی استانیاں ماسٹروں سے ہلگی ہوئی ہیں۔ اسکولوں کا تو بہانہ ہے۔ گھر میں ٹکوا نہیں لگتا تو اسکول میں گل کھلانے جاویں ہیں" وہ کہا کرتیں۔
مگر ضرورت انسان کو تھوک کر چاٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب گھر سے نکالے جانے کی نوبت آ گئی اور پاس پڑوس کے ادھار دینے والوں نے سچ مچ دروازے منہ پر مار دیئے تو ہاجرہ کو پڑوسن کی بات پر غور کرنا ہی پڑا
" وہ کوئی اور الو کے پٹھے ہوں گے۔ جو بیوی کی کمائی کھاتے ہوں گے" پوچھنے پر باقر میاں نے کہا۔" ابھی اتنا دم ہے۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کر لینا۔"

" اب تو زیور بھی نہیں رہا۔ سب تار تار کر کے بک گیا۔"
" بک گیا تو کیا ہے۔ کہا تو کہ پیسہ آیا تو تمہارا سارا زیور بنوا دوں گا۔ مری کیوں جاتی ہو۔"

" اونہہ، آچکا اب تو پیسہ۔ سال میں تین چار سو میں کیسے گزر ہو سکتی ہے۔"
" دیکھو جی اگر یہ آوارگی کرنا ہے تو طلاق لے لو اور مزے کرو۔ میں دنیا کی لعنتیں نہیں سنوں گا۔" باقر میاں نے غرا کر کہا۔ اور پھر ہاجرہ بی کو ہمت نہ ہوئی۔
ایک تو روپے کی کمی، اوپر سے سب ہی کا مزاج چڑچڑا۔ اماں جی کی تو سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔

دی - تو بی اماں نے ان کی سات پشتوں کی قبر میں کیڑے ڈال دیئے پڑھی لکھی عورتوں کے چال چلن کے بارے میں اتنے ڈراؤنے قصے سنائے کہ ہاجرہ نے کان پکڑ لیئے۔ کہ "توبہ میری، میں کہاں کر رہی ہوں نوکری ؟ یہ ساری موئی استانیاں ماسٹروں سے ہلگی ہوئی ہیں۔ اسکولوں کا تو بہانہ ہے۔ گھر میں ٹکوا نہیں لگتا تو اسکول میں گل کھلانے جاتی ہیں" وہ کہا کرتیں۔

مگر ضرورت انسان کو تھوک کر چاٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب گھر سے نکالے جانے کی نوبت آ گئی اور پاس پڑوس کے ادھار دینے والوں نے سچ مچ دروازے منہ پر مار دیئے تو ہاجرہ کو پڑوسن کی بات پر غور کرنا ہی پڑا

"وہ کوئی اور الو کے پٹھے ہوں گے۔ جو بیوی کی کمائی کھاتے ہوں گے" پوچھنے پر باقر میاں نے کہا۔ "ابھی اتنا دم ہے۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کر لینا۔"

"اب تو زیور بھی نہیں رہا۔ سب تار تار کر کے بک گیا۔"

"بک گیا تو کیا ہے۔ کہا تو کہ پیسہ آیا تو تمہارا سارا زیور بنوا دوں گا۔ مری کیوں جاتی ہو۔"

"اونہہ، آ چکا اب تو پیسہ۔ سال میں تین چار سو میں کیسے گزر ہو سکتی ہے۔"

"دیکھو جی اگر یہ آوارگی کرنا ہے تو طلاق لے لو اور مزے کرو۔ میں دنیا کی لعنتیں نہیں سنوں گا،" باقر میاں نے غرّا کر کہا۔ اور پھر ہاجرہ بی کو ہمت نہ ہوئی۔

ایک تو روپے کی کمی، اوپر سے سب ہی کا مزاج چڑچڑا۔ اماں جی کی تو سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔

ہارے ٹکا سا جواب پاکر جوں ہی گھر میں گھسے، اماں جی کا ریکارڈ پھر سے شروع ہو گیا۔ آدھی رات تک چلتی رہی چکی۔ ہاجرہ نے بھی جل کر میاں کو "نکھٹو" کہہ دیا اور باقر میاں نے حساب کتاب لگا کر ہاجرہ بی کو "پھوہڑ" ثابت کر دیا۔ اور امّاں جی نے ان دونوں کو جو کچھ باقی رہا تھا کہہ سُنایا۔ مگر کسی کے کلیجے میں ٹھنڈک نہ پڑ سکی۔

ہاجرہ بی رات بھر روتی رہیں۔

امّاں جی کراہتی رہیں۔

اور باقر میاں ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔

بیچ بیچ میں نسیم ڈراؤنے خواب دیکھ کر روتا رہا۔ اور مہینوں کی جوتم پیزار کے بعد یہ طے ہوا کہ اگر ہاجرہ بی عارضی طور پر کام کرنے لگیں تو اتنا زیادہ ہرج تو نہیں۔ جیسے ہی باقر میاں کو نوکری ملے گی، چھوڑ دیں گی۔

"ہاں جی بس اب میں نے بورڈ کی میٹنگ میں عرضی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں خود جاؤں گا۔ اسکول کمیٹی کے دفتر، دیکھتا ہوں کیا جواب دیتے ہیں"

"کوئی مجھے شوق ہے منحوس نوکری کا، تمہیں نوکری مل جائے تو میں کروں ہی کیوں؟" ہاجرہ بی نے اطمینان دلایا۔

"اے بھئی میں کون ہوں رائے دینے والی، قسمت میں جو بدا ہے سو تو ہوئے گا ہی" اماں جی نے بھی رضامندی ظاہر کی۔

اور ہاجرہ بی نے مبلغ باون روپے پر اسکول میں بچوں کی پہلی جماعت کو پڑھانا شروع کیا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ تعلیم میں علم سے

زیادہ دھموکوں اور طمانچوں کی مانگ ہے۔ صبح سے لے کے شام کے پانچ بجے تک گلا پھاڑ پھاڑ کر بچوں کو ڈانٹنا۔ ان کی مار پٹائی میں اپنی پٹائی کی دھاک بٹھا کر امن قائم کرنا۔ بڑی استانی جی کو رام کرنے کے لئے سارے وقت ان کے خاندان بھر کے لئے ساڑھیاں، بلاوز کاڑھنا، سوئٹر بننا اور لحاف توشک میں ڈورے ڈالنا۔ ہاجرہ بی کی کڑھائی کی وہ دھاک بندھی کہ ہر مہربان نے اتنی ساڑھیاں کڑھوائیں کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔ ہاجرہ بی کو اپنے سلیقے پر ناز تھا۔ آج وہ سلیقہ گلے میں پھندا بن کر پڑ گیا۔ انکار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ویسے روپے نہیں، اوپر کی کچھ آمدنی ہو ہی جاتی تھی اور کچھ نہیں تو دوپہر کے کھانے کا ہی ٹھکانہ ہو جاتا تھا۔ کبھی کوئی ساڑھی کے شکریہ میں مٹھائی یا بسکٹ ہی بچوں کے لئے دے دیتیں۔

سب کو ہی ہاجرہ بی کے گھر کا حال معلوم تھا۔ اور کچھ نہ کچھ دیتے دلاتے ہی رہتے تھے مگر ایک دن جب بڑی استانی جی نے کچھ پرانے کپڑے بچوں کے لئے دیئے تو ہاجرہ بی کو تاؤ آگیا۔ جی چاہا کہہ دیں۔ "استانی ہوں بھکارن نہیں ہوں" پر کچھ سوچ کر غصہ پی گئیں۔ کیا فائدہ بگاڑ کرنے سے۔ ذرا دو روٹی کا سہارا ہوا ہے کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر گھر آکر کپڑے مہترانی کو دے دیئے۔ اماں بی نے فوراً نوٹ کر لیا۔ باقر میاں سے آتے ہی جڑا۔

" اچھے بھلے کپڑے مہترانی کو دیئے جا رہے ہیں۔ ان کے باپ کے گھر

یوں ہی لنگر بٹے تھا۔ جبھی تو کہوں بیٹا۔" تیری کمائی میں برکت کیوں نہیں"

جب سے بیوی کو نوکری ملی تھی۔ باقر میاں کا عجب حال تھا نہ اگلے بنتی تھی نہ نگلے۔ بس چلتا تو بیوی کو ایک پل نوکری نہ کرنے دیتے۔ یار دوست مذاق ہی مذاق میں چٹکیاں بھرتے۔

" یار عیش ہیں تمہارے تو مزے ہیں۔ جورو کما کے لاتی ہے بیٹھ کے کھاتے ہو۔ یہاں بیگم کا ہماری وہ نخرہ ہے کہ معاذاللہ! ہل کے پانی نہیں پینیں۔ نئے دن زیور اور کپڑے کی فرمائش!

یار سچی بات تو یہ ہے کہ اپن کو بھی یہ آزاد قسم کی بیوی نہیں پسند اماں عورتوں کا مصرف تو یہی ہے کہ مرد کا جی خوش کرے۔ زیور کپڑے کی فرمائش کرنا تو اس کا حق ہے۔ سالا وہ بھی کیا مرد جو عورت کو زیور کپڑے کو ترسائے۔" دوسرے صاحب فرماتے۔

" بھئی تمہارا جی جگرا ہے جو بیوی کو تیرے میرے پاس بھیج دیتے ہو۔ یار، قسم خدا کی میں تو خودکشی کر لوں پر یوں جورو کے ٹکڑوں پر مجھ سے نہ اینڈا جائے۔"

" ارے یہ بورڈ کے ممبر! سالے پرلے درجے کے حرامزادے ہیں۔ یہ اسکول کا نام ہے۔ دراصل چکلے ہیں چکلے، برا نہ ماننا تمہاری بیوی تو خیر شریف ہے۔ یہ سالیاں استانیاں اول نمبر کی وہ ہوتی ہیں یہ سب ممبروں کے گھر جاتی ہیں۔"

" لاحول ولا قوۃ۔ ارے یار استانیوں کو دیکھ کر قے آتی ہے۔ سالیاں

سب کانی کھتری۔ اجاڑ صورت۔ یہ ممبر سسرے بھی گھامڑ ہوتے ہیں پورے عشق بھی لڑاتے ہیں تو کیا تھرڈ کلاس مال سے۔ یار ہمارے محلے میں ایک سالی استانی ہے۔ پیٹ بھر کے بدصورت۔ بکری کی سی کالی کالی ٹانگیں برقعے میں سے نکلی ہوئی۔ جب میرے گھر کے سامنے سے گزرتی میں لونڈوں سے کہتا۔ لٹّو دو سالی پہ کتا۔ یار بڑا مزا آتا تھا۔ لنگڑے کوے کی طرح پھدکتی بھاگتی تھی۔ بڑی پارسا بنتی تھی۔ سالی کو پیٹ رہ گیا نکالی گئی محلے سے جوتے مار کے۔"

ترکش کے تیر باقر میاں کے سینے میں اترتے رہتے اور وہ کھسیانے ہنس کر بات ٹالتے رہتے۔ سُنی ان سُنی کر جاتے۔ جب برداشت کی طاقت شل ہو جاتی تو کسی بہانے سے اٹھ کر چلے آتے۔ آتے ہی اماں جی دو چار ڈکارتیں۔

"آج نسیم کو ناشتہ بھی نہیں دیا۔ اور بیگم صاحبہ چلتی بنیں۔ میں کہوں یہ اتنے سویرے سے اسکول مرے گئے ہیں کیا ہووے ہے۔ میاں میں بڑھیا ٹھریا قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن۔ مگر مجھے تو تمہارے اوپر ترس آوے ہے۔ کیسے گزر ہوگی۔ ان بچوں پر کیا اثر پڑے گا کہ اماں کا گھڑی بھر کو بھی گھر میں نہیں ٹکے ہے۔"

باقر میاں کا خون کھولتا۔

"آج آجاوے حرامزادی۔ مزہ نہ چکھا دیا تو باپ کا نطفہ نہیں۔"

اسکول کے بعد بڑی استانی جی رجسٹروں کی جانچ پڑتال شروع کر

دیتیں یا لائبریری کی کتابوں کا فائل لے بیٹھتیں ۔ یا امتحان کے پرچے نقل کروانے لگتیں ۔ ہاجرہ بی کام کرتی جاتیں اور سوچتی جاتیں ۔

"سلو بھوکا رہ گیا ۔ اللہ اماں جی نے جانے ناشتہ کرایا کہ نہیں ۔ کہیں رات کی دال نہ دے دی ہو ۔ کچھ کھٹی سی لگی تھی ۔ کہنا بھول گئی ۔ پھینک دیتی تو اچھا ہوتا ۔ کل دھوبی کپڑے لایا تو ملانے کی مہلت ہی نہ ملی ۔ نہ جانے کیا کیا کھو کے لایا ہوگا ۔ شام کو ترکاری سستی ملتی ہے ۔ آج سلو کے لئے مٹر کی پھلیاں لے لوں گی ۔ دودھ پانی ہوتا ہے کمبخت ۔ کتنا دبلا ہوتا جا رہا ہے میرا لال ۔ جانے انہیں قمیص ملی ہو گی کہ نہیں ۔ ساری قمیصیں پھٹ گئی ہیں ۔ اب کے تنخواہ ملے تو دو قمیصوں کا کپڑا لے لوں ۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں ۔ فکر کے مارے گھلے جاتے ہیں ۔" اور اسے اس وقت کے باقر میاں یاد آ گئے ۔ جب وہ نئی نئی بیاہ کر آئی تھی ۔ کپڑوں کا کتنا شوق تھا ! بھری ہوئی تھی الماری سوٹوں سے ۔ انسان پر بڑھاپا آتا ہے سنا ہے ۔ یہاں گھر بار ہی بوڑھا ہو گیا ۔ باقر میاں تو ابھی جوان ہیں مشکل سے تیس سال کے ہوں گے ۔

"...... ہاجرہ بی ، یہ لسٹ تو ایک سرے سے غلط ہے ۔"

بڑی استانی نے چونکا دیا ۔

"جی !"

"یہ دیکھو ...... یہ تو تیسری کلاس کے نمبر ہیں ۔ یہ کہاں تم نے پہلی میں ٹھونس دئے ۔ تمہارا دل بالکل نہیں لگتا چند دن سے میں دیکھ

رہی ہوں تمہاری کلاس میں بھی غل مچتا رہتا ہے۔"

"میں ابھی دوسری لسٹ بنائے دیتی ہوں" ہاجرہ بی نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور کاغذوں پر جھک گئیں۔

بیکاری بھی انسان کو اتنا ہی بدمزاج اور نکما بنا دیتی ہے جتنا ضرورت سے زیادہ بیگار۔ سارے دن کے چڑے ہوئے، اور احساسِ کمتری کے کچلے ہوئے باقر میاں نے تھکی ہاجرہ کو دیکھا۔ تو ایک ایک کرکے سارے زخموں کے منہ کھل گئے۔

"کہاں سے تشریف آ رہی ہے اتنی دیر میں؟"

"جہنم سے۔" ہاجرہ بی نے چڑ کر کہا۔

"اے بھیا تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے ...... کماؤ بیوی ہیں کوئی مذاق ہے۔ پیٹ کو ٹکڑا دیتی ہیں۔ جب جی چاہے گا آدینگی دن بھر مکھیاں مارنے کے بعد اماں جی کو ذرا منہ کو ہوا بھی تو دینا تھی۔ لہذا آگ پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔

"میں پوچھتا ہوں کہاں لگائی اتنی دیر؟" باقر میاں بہت ضبط کرکے بولے۔

"سلیم ...... اے ستو ...... بیٹے!" ہاجرہ بی نے چاہا۔ کچھ نہ سُنے کچھ نہ دیکھے۔ نہیں تو اس کے دماغ میں سے ایک لپکتا ہوا شعلہ نکلے گا۔ جو کائنات کو بھسم کر ڈالے گا۔

"ہم بات پوچھ رہے ہیں اور نواڑن گھاتیاں بتا رہی ہے۔ حرامزادی

اُلّو کی پٹھی"۔ باقر میاں نے خوفناک انداز میں اٹھتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا۔

ہاجرہ بی نے باقر میاں کی نیم پاگل آنکھوں میں دیکھا اور سہم گئی ۔ مگر خوف نے زبان پر اور بھی زہر گھول دیا۔

" کمائی کرنے گئی تھی اور کہاں جاتی ؟"

" کمائی کی بچی ...... یہ اتنی شام تک کمائی ہو رہی تھی ؟"

" کہو تو کل سے نہیں جاؤں گی " ہاجرہ بی نے چڑانے کو مسکرا کر کہا "ایسا ہی بڑا عزت کا خیال ہے تو خود کیوں نہیں کماتے ۔ یہ خوب ہے سارا دن یہاں کمبخت بھیجا مار کے آؤ اور اوپر سے گالیاں سنو ۔ پڑے پڑے اینٹھتے ہو ۔ عورت ہو کے میں کماؤں ۔ مزے سے ٹھونس لیتے ہو ۔ اوپر سے غراتے ہو ۔" ہاجرہ بی جانتی تھی وہ سب جھوٹ کہہ رہی ہے ۔ باقر میاں نے کتنے دن ہو گئے تھے ۔ چٹخارا لے کر کھانا نہیں کھایا تھا ۔ وہ لاکھ پوچھتی "ٹھیک ہے نمک ؟" ۔ " ایں ؟ " وہ چونک کر کہتے " ہاں ہاں سب ٹھیک ہے اور پھر اپنے خیالوں کے جال میں الجھ کر ڈوب جاتے ۔ مگر اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا ۔ کوئی باقر میاں کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلا دے ۔

گالم ۔ گلوچ ، جوتم پیزار ، حسب پروگرام روزانہ کی طرح پینگ بڑھتے رہے اور بیچ بیچ میں اماں بی تیل کے چھینٹے اور کچھ تو نہیں ۔ بس یہی ۔

" کہو بھلا میاں نہے کہ پاؤں کی پیزار ۔ اری ہم نے تو اپنے خصم کے آگے کدی منہ نہ کھولا ۔ ہاں بھئی ، نکھٹو میاں اور رکھیلا کتا کسی کو نہیں بھاتا ۔"

پھر پیٹ کی پکار دم بھر کے لئے زخموں پر کھرنڈ بنا دیتی - سر جھکا خاموش منہ - چلتے رہتے - دل سلگتے رہتے - باقر میاں کھری چارپائی پر پڑے بیڑی پھونکا کرتے -

" اٹھیئے بستر کر دوں " وہ نرمی سے کہتی -

" رہنے دو " رکھائی سے جواب ملتا -

" اب ان نخروں سے کیا فائدہ " وہ کوئی نرم بات کہنا چاہتی مگر نرم باتیں تو جیسے خواب ہو گئی تھیں -

" کہہ دیا ایک دفعہ - رہنے دو " باقر میاں غراتے اور ناجرہ بی اپنی پلنگڑی پر پڑ کر گئی بیتی زندگی کے سہانے خوابوں میں کھو جاتی - — جیسے وہ خواب کسی غیر کے ہوں -

کتنے دن ہو گئے تھے وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار سے نہیں بولے تھے - نوکری کے بعد باقر میاں اس سے دور تر ہوتے چلے گئے - ہوں ہاں کے سوا بات ہی بند کر دی - وہ سمجھتی تھی اس کی اس قربانی کو سراہا جائے گا - ساس کے کچوکے کم ہو جائیں گے - میاں کا پیار تو ملے گا - میاں کما کر لاتا ہے تو بیوی اس کے عوض میں اپنا پیار دیتی ہے اگر بیوی کما کر لائے تو کیا میاں کا یہ فرض نہیں کہ وہ کم از کم اسے اپنے پیار سے تو محروم نہ کرے - آخر اس کا قصور کیا ہے - یہی نا کہ وہ سب کو فاقوں سے بچا رہی ہے - بجائے شاباشی دینے کے محلے کی عورتیں اسے حقارت سے دیکھتی ہیں جیسے وہ بازاری عورت ہو اور وہ پاک دامن

گرہستنیں۔ کیا وہ بھوکا مرجانے دیتی تو پارسائی بڑھ جاتی۔ محلّے کے مردوں کو اس کا احسان مند ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ان کی جنس کے ایک فرد کا کام انجام دے رہی ہے۔ ایک کمانے والا مرد فرعون، اور کمانے والی بیوی مُجرم! خیر اسے دنیا سے نہیں، باقر میاں سے شکایت تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے انہوں نے اسے پیار سے کلیجے سے نہیں لگایا تھا۔ ان کی محبت بھرے لمس کے لئے اس کا تھکا ماندہ جسم ترس گیا تھا۔ آج کل وہ بیکار سارا سارا دن خاموش پڑے رہتے۔ ایک دن وہ تھا جب نوکری سے عاجز تھے کہ پیار کے لئے وقت نہیں ملتا، خود اس کا جی چاہتا تھا، ہر دن اتوار ہی رہے اور اب جب کہ زندگی ایک مسلسل اتوار بن گئی تھی۔ اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ کیا وہ دن کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے؟ کیا وہ میاں کی زندگی ہی میں بیوہ ہو گئی؟

خدا نے جیسے سُن لی ایک سایہ سا اپنے اوپر جھکا ہوا محسوس ہوا۔ باقر میاں اسے سوتا سمجھ کر مڑ جانے لگے۔ تڑپ کر ہاجرہ نے اس کی آستین پکڑ لی۔ سلیم کی طرح باقر میاں سسکیاں لیتے اس کے بازوؤں میں آ گئے ساری غربت، ساری کثافت دو پیار کرنے والوں کے آنسوؤں نے دھو ڈالی۔ کتنے دُبلے ہو گئے تھے باقر میاں! اس کا گلا بھر آیا۔ ان کے گالوں میں اتنی نوکیلی ہڈیاں تو کبھی نہ تھیں جیسے صدیوں کے بعد وہ ان سے ملی ہو۔ کتنا حسین تھا یہ جسم شادی کی رات!

وہ اس کے بازو میں غافل سو رہے تھے۔ جیسے برسوں کے جاگے

ہوں۔ اب وہ اسی طرح سویا کریں گے۔ کل سے وہ اپنی کھال اتار کر ان کے قدموں کے نیچے بچھا دے گی، نہ جانے کے مہینے سے سر میں تیل بھی تو نہیں ڈالا۔ یہ ان کے بھرے بھرے ہاتھوں کو کیا ہو گیا۔ جیسے بانس کی کھپچیاں! چپکے چپکے وہ ان کی ایک ایک انگلی کو چومتی رہی، آہستہ آہستہ کہ کہیں وہ جاگ نہ جائیں۔ اس کا بازو سُن ہو گیا۔ مگر وہ ہلی نہیں بہت دن بعد سوئے تھے باقر میاں!

اس نے خواب میں دیکھا۔ باقر میاں کو نوکری مل گئی ہے۔ وہ اسکول جا رہے ہیں۔ اس نے خواب میں گلوری دی تو انہوں نے اس کی انگلی میں آہستہ سے دانت گڑو دیئے۔ ساری کائنات گدگدی سے مچل پڑی اور ہاجرہ کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اسے جھنجھوڑ کر اٹھا رہا تھا۔

"اٹھ نصیبوں جلی، تیرا ارمان پورا ہو گیا۔" اماں بی سر پیٹ کر کہہ رہی تھیں۔

"ہائے ڈائن، میرے لال کو کھا گئی۔"

ڈیوڑھی سے لوگ باقر میاں کی پائی میں بھیگی ہوئی لاش اندر لا رہے تھے۔

چڑی کی دُگی

نام نو ان کا عبد الحیٔ تھا مگر دل والیاں انہیں پیار سے دہاڑے، کہا کرتی تھیں۔ وہ تھے بھی سر سے پاؤں تک ایک حسین اور دل چسپ ہاڑے۔ گنیّ سونے کی طرح دمکتا رنگ، سورج کی کرنوں کو شرما دینے والے خم دار بال، گہری سبز آنکھیں ـــــ ایسی کہ ایک بار کوئی جی بھر کے ان میں جھانک لے تو جنم جنم گھنیرے جنگلوں میں بھٹکتا پھرے۔ میٹھی میٹھی مسکراہٹ ایک قہر کہ شہید ہونے کو جی چاہے۔ انہیں دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آجاتی تھی معلوم ہوتا تھا بڑی فرصت سے مزے لے لے کر انہیں گھڑا ہے۔

کم سنی ہی سے انہیں دل دکھانے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ گرد و نواح کی تقریباً سب لڑکیاں وقتاً فوقتاً دل ہار چکی تھیں۔ جس محفل میں چلے

جاتے دل والیوں کے کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ شوہر اپنی بیویاں سمیٹ کر چوکنے ہو جاتے۔ کنواریوں کی مائیں فوراً ان کی بہنوں اور ماں پر واری صدقے ہونے لگتیں۔ کالج میں ہی تھے کہ پیغام جھڑنے لگے۔ نوکر ہوئے ہی تو لوگوں نے یلغار بول دی بہنوں کی سہیلیوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھی کہ شمار کرنا مشکل ہو گیا — دعوتوں پر دعوتیں ہونے لگیں۔ ایک سے ایک تیکھی سلونی حسینہ مع گاڑیوں جہیز سے انہیں جیتنے پر تل پڑی۔

اگر ہزار، پچاس ساٹھ تھان کھول کر سامنے پھیلا دے تو عقل اوندھ جاتی ہے۔ انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال بیچارے "ہائے" کا ہوا کبھی ایک پسند آتی کبھی دوسری کبھی ایک ساتھ کئی کئی پسند آجاتیں۔ — اور پھر سب جی سے اتر جاتیں —

کوئی ان کے مقابلے کی تھی بھی کہاں؟ وہ تھے بھی حکم کا اکا۔ ان کے سامنے کوئی پان کا اٹھا تھی تو کوئی نہلا دہلا — ویسے دل والیاں تو چوئے پنجے سے زیادہ نہیں تھیں۔ جانتی تھیں، وہ ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ مگر دل سے مجبور تھیں، انہیں دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسوؤں سے تکیے بھگونے سے انہیں کون روک سکتا تھا۔

اور بے چاری عالمہ نری پان کی دگی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے سینے میں شاید دل نہیں تھا، کیوں کہ اگر دل ہوتا تو وہ ضرور "ہائے" کے دودھ جیسے سفید پیروں تلے لوٹتا ہوتا۔ بدصورت انسان سے انہیں

پڑتھی، خاص طور سے عورت کو تو بدصورت ہونے کا حق ہی ان کے نزدیک نہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر عورت حسین نہیں ہے تو ہے ہی کیوں؟ اسی لئے عالمہ کو دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جی بھر کے کالی، اوپر سے سینک سلائی کہ سوئی کے ناکے میں سے گھسیٹ لو۔ مجسم "معشوق کی کمر تھیں۔ لوگ ان کے والدین پر ترس کھایا کرتے تھے کہ نہ جانے کس جنم کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہاں اچھی بھلی حسین جہیز والیاں اٹھائے نہیں اٹھتیں۔ یہ اللہ کی رحمت، اسے کون اللہ والا سمیٹے گا ــــ ؟

سینک سلائی دھری تھیں۔ مگر صحت بنانے کا بڑا شوق تھا روز شام کو ریکٹ ہلاتی آ دھمکتیں۔ برسوں سے بیڈمنٹن کھیلنے پر تلی ہوئی ہوئی تھیں۔ مگر مجال ہے۔ جو ایک ہاتھ بھی مار جائیں۔ سارے کورٹ پر ٹکوڑے کی طرح اول جلول پھدکا کرتیں۔ اس اناڑی پن پر جل کر ہائے فوراً ریکٹ پھینک کر دھم سے سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔

"ارے عبدالحی صاحب اتنی جلدی تھک گئے؟" وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ٹپٹپاتیں۔ لفظ عبدل سے ہائے کو چڑ تھی۔ جیسے اوپر کے کام کا چھوکرا۔

"ورزش کیجئے عبدالحی صاحب! ورنہ موٹے تھل تھل ہو جائیں گے۔"

"شکریہ آپ کی رائے کا عالمہ خاتون صاحبہ ــ"

"پھر. . . . "

"ہاں پھر؟"

"کچھ نہیں۔" عالمہ ٹال گئی

"نہیں صاحب تکلف نہ کیجئے ـــ کہیئے نا۔"

"بے چاری دل والیوں کے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔" عالمہ بدصورت ہی نہیں بدذوق بھی تھیں۔

اس رات کسی حسین تصور میں غرق ہونے کی بجائے عبدالحی غصہ سے پھنپھناتے رہے۔ "کالی مائی۔ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے کمبخت مری ہوئی چھپکلی! خدا قسم ابکائی آتی ہے ـــ"

جب عالمہ کو معلوم ہوا کہ حی اسے چڑی کی دگی کہتے ہیں۔ تو وہ گلہری کی طرح مہین مہین آواز میں خوب ہنسی۔ کہنے لگی۔ "چلو زندگی میں ایک بات تو عقل کی کہی ـــ"

دل والیاں ہائے کے بارے میں ایسی گستاخی کی باتیں سنکر لرز اٹھتیں

"تمہارے سینے میں تو دل نہیں جوتے کا تلا ہے۔" وہ جل کر کہتیں

"تلا بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ پاؤں میں کنکر نہیں چبھتے۔" عالمہ فلسفہ جھاڑتی ـــ

"کیا ارادہ ہے؟ کیا عمر بھر شادی ہی نہیں کروگی؟"

"کروں گی کیوں نہیں؟"

"اور محبت؟"

".. محبت بغیر شادی کب ہوتی ہے۔ وہ تو طلاق ہوتی ہے۔ کوئی بھلا آدمی

ملا تو نہایت شاندار عشق کیا جائے گا۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہائے کے بارے میں کیا خیال ہے ؟"

"ذکر بھلے آدمی کا تھا ۔"

"تو وہ بھلے آدمی نہیں ۔"

"توبہ کرو۔ بھلے آدمی تو کیا ان کو تو آدمی کہنا ہی دغابازی ہے ۔"

"تمہارا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"عبدالحئی آدمی نہیں، معشوق ہیں! بھئی مجھ سے تو معشوق نہ جھیلے جائیں ارے کہاں میں نخرے اٹھاتی پھروں گی ۔"

"تو تم سمجھتی ہو کوئی تمہارے اٹھائے گا ۔ ؟"

"ضرور اٹھائے گا ؟"

"کون ؟"

"جسے عرض کرنی پڑے گی ۔"

"کبھی آئینے میں منہ دیکھا ہے ؟"

"روز دیکھتی ہوں اور آئینے سے پوچھتی ہوں، آئینے رے آئینے! ہے کوئی دنیا میں مجھ سے زیادہ حسین، آئینہ کہتا ہے، اجی توبہ کیجئے ۔" عالمہ اپنی بدصورتی کا خوب مذاق اڑاتی ۔

ایک نسخہ تھا تیر بہدف ہزار بار کا آزمایا ہوا ۔ جس کے استعمال سے عبدالحئی ہمیشہ سرخ رو ہوئے تھے ۔۔۔۔ اور وہ تھا عشق کے میدان میں دشمن کو للکارنا، اسے اپنے عشق میں گرفتار کر کے سسکا سسکا کر اس کا حلیہ بگاڑ

دینا۔ سخت تگڑدم بازی کی ضرورت ہوتی ہے اس فن میں۔ یوں دھڑے
لڑکیاں پہل کر کے عاشق ہونے کی عادی نہیں، پہلے ان پر عاشق ہونے
کا مکمل ناٹک کھیلنا پڑتا ہے ۔۔ رفتہ رفتہ ان کا کھیل ناٹک ہی بن گیا تھا۔
پہلی لڑکی سے انہیں خود بخود عشق ہو گیا تھا۔ سولہ برس کے تھے وہ بھی
اتنی ہی ہو گی۔ مگر انہیں شادی کے بازار میں ابھی آنے میں دیر تھی۔ چنانچہ
دو سال بعد لڑکی کی شادی ہو گئی اور جب یہ برسر روزگار ہوئے۔ تو
وہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس عرصے میں انہوں نے کئی عشق کئے
عشق کی مشق سے ان میں بڑی پختگی آ گئی۔ ایسے ایسے گُر انہوں نے
سیکھے کر خود کورے نکل آئیں اور مقابل چت ہو جائے۔ ہاتھ اتنا
صاف ہو گیا کہ پلک جھپکتے فتوحات حاصل ہونے لگیں۔ نظر بھر کے دیکھا
دو چار چٹختے ہوئے جملے تلی ہوئی آواز میں سرکائے گمبھیر ہری ہری آنکھوں
سے پھندا پھینکا اور مال غنیمت سمیٹ کر چل نکلے۔

مگر بدصورت لڑکیوں سے اظہار عشق کوئی کیسے کرے، بدصورت
لوگ اپنے گرد چٹانیں کھڑی کر لیتے ہیں۔ تالا مضبوط ہو تو کانٹا ٹوٹ جاتا ہے
کم سن بھولی بھالی حسینہ کو بہلانا تو انہیں آتا تھا اور کسے نہیں آتا، مگر معاملہ
کی تو وہی مثل تھی۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ راہ
بنانے کے لئے کوئی تو روزن چاہیئے۔ کھڑنجے سے سر پھوڑنا کہاں کی
دانشمندی ہو گی۔

ایسی بے بسی ان پر کبھی نہ چھائی تھی۔ ساری دل والیاں بھی مل کر

اس ایک زخم کا مرہم نہ بن سکیں جو عالمہ کی اس تلعہ بندی سے رسنے لگا تھا۔ انہوں نے بہت جال پھینکے لیکن چلی کٹی بحثوں کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ سوچا ظاہری حسن کے ذکر سے کترا کر کچھ روحانی حسن کا ذکر چھیڑا جائے مگر عالمہ فزکس میں ریسرچ کر رہی تھی۔ بھوت پریت سے اسے دلچسپی نہ تھی ویسے وہ کچھ زیادہ باشعور اور خوش خو بھی نہ تھی۔ نہایت رُٹھی۔ کج بحث آواز میٹھی تھی مگر باتیں کڑوی کسیلی۔

حتیٰ چڑ گئے۔ کھسیانی بلی بن گئے اب وہ مذاق میں قہقہے لگا کر اپنی امی سے کہتے "بھئی اس حسینہ مہ جبیناں" کو ہمارا پیغام بھیج دو کہ ہم اس پر ایک چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو چکے ہیں۔ اے پری رو، رحم فرما۔ واللہ امی، لڑکی ذات یہ حرکتیں کرتی تو اماں کی ناک چوٹی کٹ جاتی لیکن بیٹے کی ہر دلعزیزی پر وہ بھی پھولی نہ سماتی تھیں۔ جب کسی لڑکے سے پینگ بڑھاتے تو وہ بھی ہونے والی بہو پر عاشق ہو جاتیں اس کے وہ چاؤ چونچلے کرتیں کہ توبہ! پھر جب حتیٰ اکتا جاتے اور ان کا رویہ بدل جاتا تو ماں کا عشق بھی یک لخت رفو چکر ہو جاتا۔ بہنیں بھی رکھائی برتنے لگتیں۔ سچ ہے وہی سہاگن ہے جس کو پیا چاہے۔ ایک دم اس کے خاندان سے کسی بات پر لڑ بیٹھتیں اور بیٹے کی تریخ رکھتے کو کہ دیتیں۔ "اے بھئی اس لڑکی کے طور طریق ٹھیک نہیں چڑھ چڑھ کے بے ناحق آتی ہے"۔ اس کے بعد جھٹ اس کی لڑکی کی شادی ہو جاتی۔ یا کہیں دل کی مرمت کرانے روانہ کر دی جاتی اور نئے امیدوار کے سامنے ماں بہنیں مل کر اس کا مذاق اڑاتیں ـــــ

اے حیّ ذرا سیدھے منہ بات کر لینا تھا تو اتار دہی ہو گئیں مجھے تو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی تھی"۔ پھر سب مل کر کوئی نئی لڑکی پسند کرتیں۔ اس کا آنا جانا بڑھاتیں پھر سہرے کے پھولوں اور چڑھاوے کے سہانے ذکر چھڑتے۔ مگر عالمہ کیلئے مذاق میں بھی پیغام بھیجنے کا ذکر سنکر چاہت کی ماری امی سہم گئیں

" نا بیٹا، یہ مذاق پرائی لڑکی کا اڑانا اچھا نہیں جو اللہ نہ کرے ان کے باوا نے قبول کر لیا اور......"

" تو کیا ہوا؟ بس چاند سی بہو لائیے گا"

" مجھے ایسی باتیں ذرا نہیں بھاتیں۔ ان کے باوا ویسے ہی خر دماغ ہیں"

" تو کیا ہم ان کی صاحبزادی کو گالی دے رہے ہیں پیغام ہی تو بھیج رہے ہیں"

" چل ہٹ دیوانے۔ وہ تو سر آنکھوں پر اٹھائیں گے پیغام"

شرارت حد سے گزر جائے تو کمینہ پن بن جاتی ہے۔ یہ مذاق کچھ اتنا بڑھا کہ بات عالمہ کے کانوں تک پہنچی سب نے سوچا کہ سن کر رو ہی تو پڑے گی۔

مگر توبہ کیجئے جناب! عالمہ نے سنا تو کان پر ہاتھ رکھ کر بولی " نا بابا۔ میں کہاں جلیبیوں کے تھال پر سے ساری عمر مکھیاں اڑاتی پھروں گی عبدالحیٔ صاحب بھیڑے معشوق ان میں کسی کا شوہر یا ان کے بچوں کا باپ بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ مجھ جیسی بدصورت عورت کی بھی یہ ہتھا نہیں ہونی چاہیئے۔ ایسا چھبیلا دولھا مجھے کیسے ہضم ہو گا؟"

" انگور کھٹے والی بات ہے۔ ایسا حسین دولھا مل جائے تو......" دل والیاں کلس گئیں۔

"نانبھئی، میں کیا کروگی حسین دولھا کا، کوئی مجھے کرائے پر چلانا ہے؟"
حسیؒ نے سنا تو انار کی طرح چھوٹ نکلے۔ "بہت سوئر ہے کم بخت صورت سے بڑھ کر دل کالا ہے۔"

ادھر عالمہ اپنے تھنیس پر لگی ہوئی تھی۔ بیڈمنٹن کبھی کا ختم ہوگیا تھا۔ اس کا ذکر بھی پھیکا پڑ چکا تھا۔ فضا کند تھی۔ حسیؒ نے بوکھلا کر دو تین اور ہاتھ مارے۔ ایک بت کافر پاکستان سے بھی آئی۔ مگر معلوم ہوا کہ مال ایکسپورٹ کے لئے نہیں۔ ہاں دولہا کو امپورٹ کیا جا سکتا ہے مع امریکن فرم میں نوکری کے۔ عالمہ نے سنا تو بلک اٹھی۔ "ہائے ہے انہیں ایکسپورٹ کر کے چلغوزے منگوالئے جائیں۔ اللہ کتنا فائدہ رہیگا۔ قوم کا بھی فائدہ اور ملک بھی سرخرو۔"

دل والیاں لڑ پڑیں۔ انگور کھٹے اس لئے تھو تھو جو مل جائیں تو لپ لپ۔

مگر عالمہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ "عبدالحی خان کا وجود قوم اور ملک کے لئے فخر کی بات نہیں۔ ویسے عورت ذات کے لئے تو وہ زہر ہلاہل ہیں۔ وہ دلوں سے کھیلتے ہیں اور کھیلتے رہیں گے۔ بوڑھے کھوسٹ ہوجائیں گے پر یونہی میدان مارتے رہیں گے۔ نہ جانے کتنے گھر بگاڑیں گے۔ کتنوں کی بیویاں بھگائیں گے اور کتنوں کا دل خاک میں ملائیں گے۔

حسیؒ نے تو سنا تو خوب ہنسے۔

"دراصل عالمہ مجھ پر بُری طرح عاشق ہے اسی لئے مجھے بدنام کر رہی ہے کہ سب مجھ سے خوف زدہ ہو جائیں تو ......"

اماں بہنیں تو عالمہ کو نوچنے لگیں۔ جلی ککڑی مردار اور نئی امیدوار کے خواب دیکھنے لگیں ہے ہے تو گو غضب ہے کہ نہیں۔ شہزادوں کو شرما دینے والی صورت شکل۔ کماؤ پوت اور کنوارا بیٹا ہے۔ کبھی دیکھا نہ سنا

عبید صاحب، فزکس کے پروفیسر عالمہ کو تھیسس لکھنے میں مدد دیتے تھے۔ چالیس پینتالیس برس کے ہوں گے۔ بیوی کچھ سال ہوئے دو بچے چھوڑ کر مر چکی تھیں۔ ان کی طرف سے عالمہ کے لئے پیغام آیا۔ جو منظور کر لیا گیا۔ عالمہ کی بھی مرضی تھی۔

حسیؔ نے سنا تو قہقہوں سے گھر سر پر اٹھا لیا۔

"رام ملائی جوڑی، ایک اندھا ایک کوڑھی۔ چلو دو گھر نہیں بگڑے۔"

جب شادی کی مبارک باد دینے گئے تو یوں ہی کہہ دیا۔ "مگر آپ نے بھی کس بور سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"خیر زیادہ بور تو نہیں۔"

"بہت زیادہ بور ہیں۔ دوسرے ان کی شکل نہایت خطرناک ہے گنجے اگ ہیں۔"

"مجھ سے بھی زیادہ خوفناک شکل ہے؟"

"قطعی، ان کے سامنے تو آپ حسین ہیں۔"

"سچ، بس تو پھر ان سے بہتر جوڑ کہاں ملیگا دلہن کو زیادہ حسین ہونا

چاہیئے۔" عالمہ چہکی
" بڈھے الگ ہیں۔"
" دلہن کو دولہا سے کم سن ہونا چاہیئے۔"
" آپ کو ان سے محبت ہے؟"
" آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے؟"
" آپ تو جانتی ہیں محبت میری ہابی ہے اس لئے ......"
" او..... تھیسس تیار کر رہے ہیں؟" عالمہ ہنس پڑی۔" ہو سکتا ہے۔"
" میری تھیسس ٹائپ ہو کر آجائے تب ....."
" فرصت سے عشق کا پروگرام بنے گا۔" حئی نے لقمہ دیا
" ایں، خیال برا نہیں۔"
" باقاعدہ پروگرام بنا کر۔ حئی بھنا اٹھے۔" معاف کیجیے گا یہ نہایت چغد پن کی بات ہے ..... ایسے محبت کی جاتی ہے؟ گویا یہ بھی تھیسس ہو گئی"
" کیوں؟ وہ آپ ایکسپرٹ ہیں نا۔ ٹھیک، بالکل ٹھیک — تو آپ کی قیمتی رائے سے اگر مستفید ہو سکوں تو ...... ویسے کچھ آپ سے سیکھا تو بے اندازاً کچھ مشکل کام نہیں۔ آپ تو مشاق ہیں کھٹا کھٹ پانچ منٹ میں میدان صاف۔" عالمہ نے چٹکی بجا کر کہا۔
" آپ قطعی اناڑی ہیں"
" اونھ کوئی مضائقہ نہیں۔ عبید صاحب کچھ عشق وشق کے ساتھ دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہایت پریکٹیکل قسم کے آدمی ہیں۔"

"آپ ان کے ساتھ خوش رہ سکیں گی؟"

"خوش رہنا اتنا مشکل کام نہیں۔ اپنا نجی فعل ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ غریبی۔ بدصورتی بری صحت کوئی بلا بھی مجھے آج تک پست نہ کر سکی۔ مجھے یقین ہے میں بہت خوش رہوں گی"۔

"یہ شادی نہیں ہوگی!"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ عشق کی ہتک کر رہی ہیں"

عالمہ اور عبید صاحب کی شادی نہیں ہو سکی۔ حیؔ نے عبید صاحب سے جا کر صاف صاف کہہ دیا کہ عالمہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔

"کیوں؟ عبید صاحب بھونچکے رہ گئے"۔

"کیونکہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے"

"ہیں؟ کس سے؟"

"مجھ سے!" حیؔ نے مسکین صورت بنا کر آنکھیں جھکا لیں۔

"مگر...... مگر آپ!"

"جی ــــ" حیؔ نے گردن جھکا لی۔

حیؔ کے جانے کے بعد عبید صاحب کو یقین ہو گیا کہ عشق واقعی اندھا ہوتا ہے"

گھر میں صف ماتم بچھ گئی...... مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے"۔

"اس غریب کی زندگی برباد کر کے تجھے کیا ملا؟" اماں نے آنسو

بھر کے کہا " اس بدنامی کے بعد اب نگوڑی کو کون قبول لے گا ؟"
" میں ہی بھگتوں گا کم بخت کو " حمی نے منہ لٹکا لیا۔ عالمہ نے طوفان سر پر اٹھالیا۔
" قیامت ہو جائے میں اس پگلے سے شادی نہیں کروں گی اس لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ سب عورتیں اس پر رحم کھا کر مہربانیاں کرتی رہیں "
" پگلا کیسے ہوا " لوگوں نے پوچھا " تمہیں پسند کرتا ہے اس لئے ؟"
" ہاں اسی لئے۔ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے جو کوئی باہوش و حواس انسان پسند کرے "
کیا کیا ہنگامے ہوئے خودکشیوں کی دھمکیاں چلیں۔
" ہائے تجھے تو چڑی کی ڈگی سے گھن آتی تھی " اماں بلکیں
" وہ تو آتی ہے اور آتی رہے گی "
" پھر تجھے کیا ہو گیا ہے میرے لال کیوں اپنی زندگی مٹی میں ملا رہا ہے ؟"
" کالی مائی نے جادو کر دیا ہے " حمی نے مسکین صورت بنا کر کہا اور بڑی دھوم دھام سے اپنی زندگی مٹی میں ملا دی۔
دیکھ لینا چار دن میں طلاق دے کر میکے پھنکوا دے گا " سب نے پیشیں گوئی کی۔
آج اس حادثے کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ اس بے ہنگم جوڑے کو دیکھ کر دل سے ایک لمبی چوڑی ہائے نکل جاتی ہے۔ سچ ہے چڑی کی ڈگی اگر ترپ کی ہو تو حکم کا اکہ کٹ جاتا ہے۔

بچھو پھوپھی

جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کھلتی تھی اور قانوناً اسے بند رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ پردے والی بی بیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔ رحمان بھائی رنڈیوں کے جمعدار تھے۔ کوئی شادی، بیاہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسم ہوتی، رحمان بھائی اونے پونے ان رنڈیوں کو بلا دیتے اور غریب کے گھر میں بھی وحیدہ جان۔ مشتری بائی اور انوری کہروا ناچ جاتیں۔

مگر محلے ٹولے کی لڑکیاں بالیاں ان کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں ان کے چھوٹے بھائی بُندو اور گیندا آئے دن تاک جھانک کے سلسلہ میں سر پھٹول کیا کرتے تھے، ویسے رحمان بھائی محلے کی نظروں میں کوئی اچھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی کی

زندگی ہی میں اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔ اس یتیم سالی کا سوائے اس بہن کے اور کوئی مرا جیتا نہ تھا۔ بہن کے ہاں پڑی رہتی۔ اس کے بچے پالتی تھی۔ بس دودھ پلانے کی کسر تھی۔ باقی سارا گو موت وہی کرتی تھی اور پھر کسی نک چڑھی نے اسے بہن کے بچے کے منہ میں ایک دن چھاتی دیتے دیکھ لیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور پتہ چلا کہ بچوں میں آدھے بالکل "خالہ" کی صورت پہ ہیں۔ گھر میں رحمان کی دلہن چاہے بہن کی دُرگت بناتی ہوں پر کبھی پنچوں میں اقرار نہ کیا۔ یہی کہا کرتی تھیں

"جو کنواری کو کہے گا، اس کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے گا۔"

ہاں بر کی تلاش میں ہر دم سوکھا کرتی تھیں، پر اس کیڑے بھرے کباب کو کہاں چڑھتا؟

ایک آنکھ میں یہ بڑی کوڑی سی پھلی تھی۔ پیر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا۔ کولھا دبا کر چلتی تھی۔

سارے محلے سے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ رحمان بھائی سے کام پڑتا تو وصونس جما کر کہہ دیتے۔ محلّے میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ یہی کیا کم عنایت تھی۔ رحمان بھائی اسی کو اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر طویل طویل گالیاں دیا کرتی تھیں۔ کیونکہ باقی محلّے کے لوگ ابّا سے دبتے تھے۔ مجسٹریٹ سے کون بیر مول لے۔

اس دن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اکلوتی سگی پھوپھی بادشاہی خانم ہیں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جارہی تھیں۔

اماں کا چہرہ فق تھا اور وہ اندر کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں۔ جیسے بچھو پھوپھی کی آواز ان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑی ہو۔ چھٹے چھ ماہے اسی طرح بادشاہی خانم رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہنکارتیں۔ ابّا میاں ان سے ذرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے بالے کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپھی بادشاہی پھر شستہ بیاں چھوڑنے لگتیں ہم لوگ سب کھیل کود، پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مڑ مڑ اپنی پیاری پھوپھی کے کوسنے سنا کرتے۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھتی تھیں وہ ان کے طول طویل جسم سے لبالب بھری ہوئی تھی۔

ابا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں۔ جیسے وہی مونچھیں اتار کر دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئے ہوں۔ اور باوجود کوسنے اور گالیاں سننے کے ہم لوگ بڑے اطمینان سے انہیں تکا کرتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی۔ شیر کا سا کلّا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت۔ بھاری سی ٹھوڑی اور آواز تو ماشاء اللہ ابّا میاں سے ایک سُر نیچی ہی ہوگی —— !

پھوپھی بادشاہی ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔
جس دن پھوپا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں کرنی شروع کیں۔ پھوپھی نے بٹے سے ساری چوڑیاں چھنا چھن توڑ ڈالیں ـــــ رنگا ڈوپٹہ اتار دیا اور اس دن سے وہ انہیں "مرحوم" یا "مرنے والا" کہا کرتی تھیں۔ مہترانی کو چھونے کے بعد انہوں نے وہ ہاتھ پیر اپنے جسم کو نہ لگنے دیئے۔
یہ سانحہ خاصی جوانی میں ہوا تھا اور وہ جب سے "رنڈاپا" جھیل رہی تھیں۔ ہمارے پھوپھا ہماری اماں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا۔ میرے ابا میری اماں کے چچا لگتے تھے، اور شادی سے پہلے، جب وہ چھوٹی سی تھیں۔ تو میرے ابا کو دیکھ کر ان کا پیشاب نکل جاتا تھا۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوا۔ کہ ان کی منگنی اسی بھیانک دیو سے ہونے والی ہے تو انہوں نے اپنی دادی یعنی ابا کی پھوپھی کی پٹاری سے افیون چرا کر کھالی تھی۔ افیون زیادہ نہیں تھی اور وہ کچھ دن لوٹ پوٹ کر اچھی ہو گئیں۔ ان دنوں ابا علیگڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔
ان کی بیماری کی خبر سن کر امتحان چھوڑ کر بھاگے ـــــ بڑی مشکل سے ہمارے نانا جو ابا کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے اور بزرگ دوست بھی۔ انہوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے

بھیجا تھا۔ جتنی دیر وہ رہے، بھوکے پیاسے ٹہلتے رہے۔
ادھ کھلی آنکھوں سے میری اماں نے ان کا چوڑا چکلا سایہ پردے
کے پیچھے بے قراری سے تڑپتے دیکھا۔

"امراؤ بھائی! اگر انہیں کچھ ہو گیا..... تو......" دیو کی
آواز لرز رہی تھی۔

نانا میاں خوب ہنسے۔

"نہیں برادر خاطر جمع رکھو۔ کچھ نہ ہوگا۔"

اس وقت میری ننھی سی معصوم ماں ایک دم عورت بن گئی
تھی۔ اس کے دل سے ایک دم دیو نما انسان کا خوف نکل گیا
تھا۔ جبھی تو میری پھوپھی بادشاہی کہتی تھیں۔ میری اماں
جادوگرنی ہے اور اس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے
تعلق ہو کر پیٹ گرا تھا۔ میری اماں اپنے جوان بچوں کے
سامنے جب یہ گالیاں سنتیں۔ تو ایسی بسور بسور کر روتیں۔ کہ
ہمیں ان کی مار فراموش ہو جاتی۔ اور پیار آنے لگتا — مگر
یہ گالیاں سن کر ابا کی گمبھیر آنکھوں میں پریاں ناچنے
لگتیں۔ وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعے،
کہلوا بھیجتے۔

"کیوں پھوپھی، آج کیا کھایا ہے؟"

"تیری میا کا کلیجہ۔"

اس بے تُکے جواب سے پھوپی جل کر مرندا ہو جاتیں، ابا پھر جواب دلواتے۔

"ارے پھوپھی، جب ہی منہ میں بواسیر ہو گئی ہے۔ جلاّب تو جلاّب!"

وہ میرے نوجوان بھائی کی مچلتی لاش پر کوّوں، چیلوں کو دعوت دینے لگتیں۔ ان کی دُلھن کو جو نہ جانے بے چاری اس وقت کہاں بیٹھی اپنے خیالی دولھا کے عشق میں لرز رہی ہوگی۔ رنڈاپے کی دعائیں دیتیں اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دے کر بُد بُداتیں۔

"جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو"

پھر ابا اُکساتے اور نھنے بھائی پوچھتے۔

"پھوپھی بادشاہی، مہترانی پھوپھی کا مزاج تو اچھا ہے؟" اور ہمیں ڈر لگتا کہ کہیں پھوپھی کھڑکی میں سے پھاند نہ پڑیں۔

"ارے جا سنپولئے میرے منہ نہ لگ۔ نہیں تو جوتی سے منہ مسل دوں گی۔ یہ بڈھا اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مغل بچہ ہے تو سامنے آکر بات کرے۔"

رحمان بھائی، اے رحمان بھائی، اس بورانی کتیا کو سنکھیا کیوں نہیں کھلاتے۔" ابا کے سکھانے پر نھنے بھائی ڈرتے ہوئے بولے ـــــ حالاں کہ انہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت تو نہ تھی

کیوں کہ سب جانتے تھے کہ آواز ان کی ہے مگر الفاظ ابا میاں کے ہیں۔ لہٰذا گناہ ننھے بھائی کی جان پر نہیں۔ مگر پھر بھی بالکل ابا کی شکل کی پھوپھی کی شان میں کچھ کہتے ہوئے انہیں پسینے آجاتے تھے۔

کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہمارے ددھیال اور ننھیال والوں میں ننھیال حکیموں گلی میں تھی اور ددھیال گاڑی بانوں کٹہڑے میں۔ ننھیال والے سلیم چشتی کے خاندان سے تھے۔ جنہیں مغل بادشاہ نے مرشد کا مرتبہ دے کر نجات کا راستہ پہچانا۔ ہندوستان میں بسے اسے عرصہ گزر چکا تھا۔ رنگتیں سنولا چکی تھیں نقوش نرم پڑ چکے تھے۔ مزاج ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

ددھیال والے باہر سے سب سے آخری کھیپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کمر کٹہرے تلوار جیسے نقوش، لال فرنگیوں جیسے منہ، گریلوں جیسی قد و قامت، شیروں جیسی گرجدار آوازیں، شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔

اور ننھیال والے، نازک ہاتھ پیروں والے، شاعرانہ طبیعت کے دھیمی آوازیں بولنے چالنے کے عادی۔ زیادہ تر حکیم، عالم اور مولوی تھے۔ جبھی محلے کا نام حکیموں گلی پڑ گیا تھا۔ کچھ کاروبار میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ شال باف زردوز اور عطار وغیرہ بن چکے تھے۔ حالانکہ میری ددھیال والے ایسے لوگوں کو کنجڑے قصائی ہی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کشتی پہلوانی تیراکی میں نام پیدا

کرنا، پنجہ لڑانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور چوسر پچیسی کو جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے۔ ہیجڑوں کے کھیل سمجھنا۔

کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو لاوا وادی کی گود میں اُتر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ددھیال والے ننھیال والوں کی طرف خود بخود کھنچ کر آ گئے، یہ میل کب اور کس نے شروع کیا۔ سب شجرے میں لکھا ہے مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرے دادا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دادیاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مگر ایک چھوٹی سی بہن بن بیاہی تھی۔ نہ جانے کیوں کر وہ شیخوں میں بیاہ دی گئی۔ شاید میری اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ انہوں نے اپنی بہن بقول پھوپھی بادشاہی کنجڑوں قصائیوں میں دے دی۔ اپنے مرحوم شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ اپنے باپ کو قبر میں چین نہ ملنے کی بد دعائیں دیا کرتیں جنہوں نے چغتائی خاندان کی مٹی پلید کر دی۔

میری پھوپھی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا، میرے ابا میاں اور میرے چچا، بڑے دوان سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے تھے۔ تین بھائیوں کی ایک لاڈلی بہن ہمیشہ کی نخریلی اور تنک مزاج تھیں وہ ہمیشہ تینوں پر رعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں۔ بالکل لونڈوں کی طرح پلیں، شہ سواری تیر اندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاصی مشق تھی ویسے تو پھیل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں۔ مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔ سینہ تھا بھی چار عورتوں جتنا۔

ابا مذاق میں اماں کو چھیڑا کرتے۔

"بیگم، بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟"

"اوئی توبہ میری۔" عالم فاضل باپ کی بیٹی، میری اماں کان پر ہاتھ دھر کر کہتیں۔ مگر وہ ننھے بھائی سے فوراً پھوپھی کو چیلنج بھجواتے۔

"پھوپی، ہماری اماں سے کشتی لڑو گی؟"

"ہاں، ہاں۔ بلا اپنی اماں کو۔ آ جائے خم ٹھوک کر۔ ارے اُلّو نہ بنا دوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بلا۔ بلا ملازادی کو..."

اور میری اماں اپنا لکھنؤ کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ سمیٹ کر کونے میں دبک جاتیں۔

"پھوپی بادشاہی، دادا میاں گنوار تھے نا؟ بڑے نانا جان انہیں آمدنامہ پڑھایا کرتے تھے" ہمارے پر نانا کے دادا نے کبھی دادا میاں کو کچھ پڑھا دیا ہوگا۔ ابا میاں چھیڑنے کو بات توڑ موڑ کر کہلواتے۔

"ارے وہ استنجے کا ڈھیلا کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ مجاور کہیں کا، ہمارے ٹکڑوں پر پلتا تھا۔" یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ کے رشتے سے حساب لگایا جاتا۔ ہم لوگ یعنی چغتائی اکبر بادشاہ کے خاندان سے تھے۔ جنہوں نے میری ننھیال کے سلیم چشتی کو پیر و مرشد کہا تھا۔ مگر پھوپھی کہتیں

"خاک، پیر و مرشد کی دُم! مجاور تھے مجاور"

تین بھائی تھے مگر تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی اور وہ غصہ ہوئیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی اللہ والے تھے انہیں حقارت سے فقیر اور بھیک منگا کہتیں۔ ہمارے ابا گورنمنٹ سروس میں تھے۔ انہیں غدار اور انگریزوں

کے غلام کہنئیں، کیوں کہ مغل شاہی انگریزوں نے ختم کر ڈالی ورنہ آج "مرحوم" پتلی دال کے کھانے والے جولاہے یعنی میرے پھوپھا کے بجائے وہ لال قلعے میں زیب النساء کی طرح عرق گلاب میں غسل فرماکر کسی ملک کے شہنشاہ کی ملکہ بنی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے یعنی چچا بڑے دس نمبر کے بدمعاشوں میں سے تھے اور سپاہی ڈرتا ڈرتا مجسٹریٹ بھائی کے گھر ان کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔ انہوں نے کئی قتل کئے تھے، ڈاکے ڈالے تھے۔ شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے وہ انہیں ڈاکو کہا کرتی تھیں جو ان کے کیرکٹر کو دیکھتے ہوئے قطعی پھُسپھُسا لفظ تھا۔

مگر جب وہ اپنے مرحوم شوہر سے غصہ ہوتیں تو کہا کرتیں "منہ جلے نگوڑی ناہٹی نہیں ہوں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں ان کو خبر ہو گئی تو دنیا کا نہ رہے گا اور کچھ نہیں اگر چھوٹا سن لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھما دے۔ ڈاکو ہے ڈاکو ——— اس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑا دے گا۔ ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بھی بچ گیا تو بڑا جو اینڈو والا ہے تیری عافیت خاک میں ملا دے گا۔ دیکھ مغل بچی ہوں تیری اماں کی طرح شیخانی قصائی نہیں" مگر میرے پھوپھا اچھی طرح جانتے ہیں کہ تینوں بھائی ان پر رحم کھاتے ہیں اور وہ بیٹھے مسکراتے رہتے ہیں۔ وہی بیٹھی بیٹھی زہریلی مسکراہٹ جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے ددھیال والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔

ہر عید بقر عید کو میرے ابا میاں بیٹوں کو لے کر عید گاہ سے سیدھے پھوپی

اماں کے ہاں کو سنے اور گالیاں سننے جایا کرتے، وہ فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھڑی میں سے میری جادوگرنی ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔ نوکر کو بلا کر سویاں بھجوائیں مگر یہ کہتیں ”پڑوسن نے بھیجی ہیں۔“

”ان میں زہر تو نہیں ملا ہوا ہے؟“ ابا چھیڑنے کو کہتے اور پھر ساری ننھیال کے چیتھڑے بکھیرے جاتے۔ سویاں کھا کر ابا عیدی دیتے جو وہ فوراً زمین پر پھینک دیتیں کہ

”اپنے سالوں کو دو۔ وہی تمہاری روٹیوں پر پلے ہیں۔“

اور ابا چپ چاپ چلے آتے اور وہ جانتے تھے کہ پھوپی بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی۔ بھتیجوں کو وہ آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں۔

”حرامزادو! اگر اماں ابا کو بتلایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی۔“ اماں ابا کو معلوم تھا کہ لڑکوں کو کتنی عید ملی۔ اگر کسی عید پر ابا میاں کسی وجہ سے نہ جا پاتے تو پیغام پر پیغام آتے

”نصرت خانم بیوہ ہو گئیں، چلو اچھا ہوا۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔“ بُرے بُرے پیغام شام تک آتے ہی رہتے اور پھر وہ خود رحمان بھائی کے کوٹھے پر سے گالیاں برسانے آ جاتیں۔

ایک دن عید کی سویاں کھاتے کھاتے کچھ گرمی سے جی مالش کرنے لگا۔ ابا میاں کو الٹی ہو گئی۔

”لو بادشاہی خانم، کہا سنا معاف کرنا، ہم تو چلے۔“ ابا میاں نے کراہ کی

آواز بنائی اور پھوپھی لشتم پشتم پردہ پھینک چھاتی کوٹتی نکل آئیں۔ ابا کو شرارت سے ہنستا دیکھ کر الٹے پاؤں کوستی لوٹ گئیں

"تم آگئیں تو بادشاہی ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے۔ ورنہ ہم تو آج ختم ہی ہو جاتے" ابا نے کہا۔ نہ پوچھئے پھوپی نے کتنے وزنی کوسنے دیئے۔ انہیں خطرے سے باہر دیکھ کر بولیں۔

"اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑو گے۔ کوئی میت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا" اور ابا چڑانے کو انہیں دو روپے بھجوا دیتے "بھئی ہماری خاندانی ڈومنیاں گالیاں دیدیں تو انھیں بیل لو تنی ہی چاہیئے" اور پھوپھی بوکھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔

"بیل دے اپنی اماں بہنیا کو" اور پھر فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں۔ خود ہی کہتیں۔ "اے بادشاہی بندی، تیرے منہ کو کالک لگے۔ اپنی میت آپ پیٹ رہی ہے"، پھوپھی کو اصل میں بھائی سے ہی بیر تھا۔ بس ان کے نام پر آگ لگ جاتی، ویسے کہیں ابا کے بغیر اماں نظر آجاتیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے "پھوپنچھو" کہتیں "بچے تو اچھے ہیں" وہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچے اسی بدذات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے ابد تک کوستی رہیں گی اماں ان کی بھتیجی بھی تو تھیں۔ بھئی کس قدر گھپلا تھا میری ددھیال ننھیال میں۔ ایک رشتے سے میں اپنی اماں کی بہن بھی لگتی تھی اس طرح میرے ابا میرے دولہا بھائی بھی ہونے تھے۔ میری ددھیال کو ننھیال والوں نے کیا کیا غم نہ دیئے۔ غضب تو جب ہوا جب میری

پھوپھی کی بیٹی مسرت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھیں۔

ہوا یہ کہ میری اماں کی دادی، یعنی ابّا کی پھوپی جب لبِ دم ہوئیں تو دونوں طرف کے لوگ تیمار داری کو پہنچے۔ میرے ماموں بھی اپنی دادی کو دیکھنے گئے۔ اور مسرت خانم بھی اپنی اماں کے ساتھ ان کی پھوپی کو دیکھنے آئیں۔

بادشاہی پھوپھی کو کچھ ڈر، خوف تو تھا نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے ننھیال والوں کی طرف سے انہوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے۔ اور پندرہ برس کی مسرت خانم کا ابھی سن ہی کیا تھا۔ اماں کے کولھے سے لگ کر سوتی تھیں۔ دودھ پیتی ہی تو انہیں لگتی تھیں۔

پھر جب میرے ماموں نے اپنی کرنجی شربت بھری آنکھوں سے مسرت جہاں کے لچکدار سراپے کو دیکھا تو وہیں کی وہیں جم کر رہ گئیں۔

دن بھر بڑے بوڑھے تیمار داری کر کے تھک ہار کر سو جاتے تو یہ فرمانبردار بچے سرہانے بیٹھے مریضہ پر کم، ایک دوسرے پر زیادہ نگاہ رکھتے۔ جب مسرت جہاں برف میں تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھاتیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔

دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ لرزتی کانپتی گاؤ تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھیں۔ اٹھتے ہی سارے خاندان کے ذمہ دار لوگوں کو طلب کیا جب سب جمع ہو گئے تو حکم ہوا۔

"قاضی کو بلواؤ۔"

لوگ پریشان کہ بڑھیا قاضی کو کیوں بلا رہی ہے، کیا آخری وقت سہاگ رچائے گی، کس کو دم مارنے کی ہمت تھی۔

"دونوں کا نکاح پڑھواؤ۔" لوگ چکرائے کن دونوں کا۔ مگر اِدھر مسرت جہاں پٹ سے بے ہوش ہو کر گریں۔ اُدھر ظفر ماموں بوکھلا کر باہر چلے - چور پکڑے گئے۔ نکاح ہو گیا۔ بادشاہی پھوپھی سناٹے میں رہ گئیں۔

حالانکہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی - دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے۔ مگر بڑی بی کے لئے بس یہی حد تھی۔

اور پھر جو بادشاہی پھوپھی کو دورہ پڑا ہے تو بس گھوڑے اور تلوار کے بغیر انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا۔ مجبوراً ابّا میاں دولہا دلہن کو اپنے گھر لے آئے۔ اماں تو چاند سی بھابی کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ بڑی دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔

بادشاہی پھوپھی نے اس دن سے پھوپھی کا منہ نہیں دیکھا۔ بھائی سے پردہ کر لیا۔ میاں سے پہلے ہی ناچاقی تھی۔ دنیا سے منہ پھیر لیا اور ایک زہر تھا کہ ان کے دل و دماغ پر چڑھتا ہی گیا۔ زندگی سانپ کے پھن کی طرح ڈسنے لگی۔

"بڑھیا نے پوتے کے لئے میری بچی کو پھنسانے کے لئے مکر گانٹھا تھا۔" وہ برابر یہی کہے جاتیں کیونکہ واقعی وہ اس کے بعد بیس سال تک

اور جئیں - کون جانے ٹھیک ہی کہتی ہوں پھوپھی۔

مرتے دم تک بہن بھائی میں میل نہ ہوا - جب ابا میاں پر فالج کا چوتھا حملہ ہوا اور بالکل ہی وقت آگیا تو انہوں نے پھوپھی بادشاہی کو کہلا بھیجا - " بادشاہی خانم! ہمارا آخری وقت ہے - دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو آجاؤ "

نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے - بھیاّ نے پھینکے اور بہنیا کے دل میں ترازو ہو گئے - بلبلاتی، چھاتی کوٹتی، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی خانم اس ڈیوڑھی پر اتریں جہاں اب تک انہوں نے قدم نہیں رکھا تھا۔

" لو بادشاہی، تمھاری دعا پوری ہو رہی ہے " ابا میاں تکلیف میں بھی مسکرا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں۔

پھوپھی بادشاہی باوجود بالوں کے وہی منی سی بچھو لگ رہی تھیں جو بچپن میں بھائیوں سے مچل مچل کر بات منوالیا کرتی تھیں - ان کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں ایک میمنے کی معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو ان کی سنگ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

" ہمیں کوسو بجھو بی " ابا نے پیار سے کہا - میری اماں نے سسکتے ہوئے بادشاہی خانم سے کوسنے کی بھیک مانگی ۔

" یا اللہ .... یا اللہ " انہوں نے گرجنا چاہا - مگر کانپ کر رہ گئیں - " یا اللہ ...... یا اللہ ...... میری عمر میرے بھیا

کو دیدے ...... یا مولا ...... اپنے رسول کا صدقہ ......" وہ اس بچے کی طرح جھنجھلا کر رو پڑیں۔ جیسے سبق یاد نہ ہو۔

سب کے منہ فق ہو گئے ۔ اماں کے پیروں کا دم نکل گیا۔ یا خدا! آج بجھو پھوپھی کے منہ سے بھائی کے لئے ایک کوسنا نہ نکلا۔

صرف ابا میاں مسکرا رہے تھے۔ جیسے ان کے کوسنے سن کر مسکرا دیا کرتے تھے۔

سچ ہے، بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

٭٭٭

کلّو کی ماں

جمو بجیا کے جالے کا جوڑا دھوم دھڑاکے سے سل رہا تھا۔ چچی بی اور اماں جی میں دھواں دھار بحث ہو رہی تھی۔ چچی بی مصر تھیں کہ چمپا طوئی کا زمانہ گیا۔ نئے فیشن کی رو سے بنت کے اوپر تلے اسنبولی بیل اور گنگا جمنی کرن خوب کھلے گی۔ اماں جی کہتی تھیں۔

"کرن موئی نغقتی دو گھڑی میں ہٹ کر سٹکی ہو جاوے ہے۔ چمپا برسوں بھی رہوے ہے۔"

بجیا اپنے جہیز سے دور بے تعلق سی بیٹھی، بچوں کے سنگ کوٹ پیس کھیل رہی تھیں۔ مگر جی ان کا بنت اور گوکھرو میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ان دیدے کا پانی ڈھلی کنواریوں میں سے نہ تھیں جو کھلے بندوں بیٹھ کر اپنا جہیز سینتی ہیں۔ کبھی ان سے کچھ ٹنکوانا ہوتا تو چچی بی کہتیں۔

"جمو بیٹی ذرا میرے کرتے پہ مخمل کے پھول ٹانک دو۔" بجیا سمجھ

جاتیں مگر پھول ٹانک دیتیں۔ سب کے سامنے نہیں۔ دالان در دالان لے جاکر۔ چچی بی نے پستئی کریپ کے ڈوپٹے پر ٹاپیٹی کی بنت کے آس پاس اسنبوتی بیل اور گنگا جمنی کرن جما کر پوچھا۔

"کیوں جمو، کیسا لگتا ہے؟"

بجیا شرم سے کتارہ ہو گئیں اور بوکھلاہٹ میں اپنے اڑی کے اکے پر ترپ مار دیا۔ اماں جی نے کہا: "ہے ہے دولھن، خدا خیر کرے، تمہاری تو جانو مت ماری گئی ہے۔ اے وہ بچاری کیا بولے گی۔"

مگر کہنا چچی بی کا ماننا پڑا۔ چچی بی تھیں بھی تو فیشن ایبل۔ پوپٹوں کے بال کا فیشن وہ اپنے میکے سے لائیں جو سارے محلے میں وبا کی طرح پھیل گیا۔ کاشغاری سیندھ تک پوتتی تھیں۔ سرخ پتنگ کا کاغذ جس میں زیور بندھ کر آتے ہمیشہ ان کی پاندان کی ڈبیا میں اڑسا رہتا۔ سب کی آنکھ بچا کے پان کھاتے وقت ہونٹوں پر کاغذ تھوک سے تر کر کے گھِسّا مار لیتیں۔ اور ان کے جسالوں لپ اسٹک لگ جاتی۔ کرن کے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد جوڑا سلنے لگا۔ چندھی میّا نے ترنگ میں آکر لرزتی بلغم بھری آواز میں بنڑے گانے شروع کر دیئے۔ ایک دم جیسے سب کے دلوں میں شہنائیاں بج اٹھیں۔ شادیوں کا موسم سا ٹوٹ پڑا۔ جوڑے سے یہ جوڑے لگائے جانے لگے۔ رفیق میاں کی رضیہ بی سے فریدہ بی کی بنو میاں سے، رشید میاں کی صفو بی سے ڈور باندھی جانے لگی۔

"تو کس سے بیاہ کرے گا رے؟" مذاق میں چچی بی نے چھبو سے پوچھا

"تم سے!" دو برس کے چھبو نے ماں کی گود میں مچل کر فیصلہ کیا۔ سب ہنس پڑے۔ بات ہنسی ہی ہنسی میں جھینپتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ کنواری بجیا کے ہونے والے لڑکے یا لڑکی کا بھی جوڑا لگا دیا گیا۔ کلو کی ماں دہلیز پر بیٹھی دھنیا کی گری کوٹ رہی تھیں۔ ترنگ میں آکر بولیں۔ "اے رے کلوے تو کس سے بیاہ کرے گا؟"

"چھابہ بی بی سے"۔ پانچ برس کے کلوے نے کیا کالوں والی تو شابہ بی کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا۔ اور چھابہ بی بی کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ سب ہی ہنس پڑے مگر چچی بی کا شہابی رنگ تمتما کر قرمزی ہو گیا۔ اٹھا جوتی۔ تڑا تڑ کلو کے ناک، منہ اور سر پر جڑ دیں۔ ہنسی میں کھنسی ہو گئی۔ تاش کے پتے پھینک پھانک جمو بجیا روتے ہوئے چھپر کو کوٹھے پر لٹکا کے ٹمکنے لگیں۔ اماں جی نے بسورتی ہوئی چھابہ کو گود میں سمیٹ لیا۔ کلو کی ناک سے جیتے جیتے خون کی تیلی بہنے لگی۔ کلو کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر دھاڑی — "ہائے میرے پوت کو مار ڈالا۔ ہائے میرا بن باپ کا بچہ۔"

"کلوے کا بچہ۔ خیرات کے ٹکڑوں پر پلنے والا اور اس کے یہ لچھن — موری کا کیڑا اور دماغ آسمان پر۔" چچی بی کا پٹھانی خون کھول کر لاوا بن گیا۔ "حرامزادے کو روٹیاں لگی ہیں۔"

"ہے ہے، دلہن، سید بچہ ہے۔" اماں جی نے سر پیٹ لیا۔ "اس کی بساط ہی کیا۔ تم کاہے کو اپنی عاقبت سنوارو۔"

"چولھے میں پڑے سید بچہ اور بھاڑ میں جائے سیدانی۔ میری بچی کی طرف

آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو دیدے نکال لوں گی۔" اماں جی روکتی رہیں، پر بچی بی بپھر چکی تھیں۔ کلو کی ماں نے اوپر سے دو دھموکے کلو کی پیٹھ پر اور جمائے اور اس کی سات پشتوں کو کوسنے لگیں۔

"اے تجھے ڈھائی گھڑی کی آوے۔ باوا کو کھا گیا۔ اب جنم جلی کے سر چھپانے کی جگہ تھی۔ سو بھی ملیامیٹ کر کے دم لے گا — خدائی خوار، نامراد۔" وہ اسے گھسیٹتی ہوئی باورچی خانے میں لے گئیں۔

کلو کی ماں ویسے ہماری دور کی خالہ تھیں۔ پڑوسنوں کو خالہ کہہ لیتے پر انہیں خالہ کہتے عار سی آتی۔ امتیازی تو نہ کہتے پر کلو کی ماں ضرور کہتے۔ گرتے گرتے ان کی پوزیشن نوکروں جیسی ہو گئی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتیں، دو چار دن کی مہمانداری کے بعد لوگ دھیرے دھیرے انہیں ڈھب پر لے آتے۔ ماما کھسکا دی جاتی اور وہ بغیر تنخواہ کے صرف پھٹے پرانے کپڑے اور روٹی پر ماما کا عہدہ سنبھال لیتیں۔ میاں لام پر گئے۔ سو نہ جانے کس کی گولی کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ امتیازی خالہ کا تو کسی لال منہ والے سے بیر بھی نہ تھا۔ پر اللہ جانے کس اللہ کے بندے نے ان کی مانگ اُجاڑ دی۔

تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں۔ بھلا اپنے رشتہ داروں کو تنخواہ دے کر کون ذلیل کر سکتا ہے؟ ہاں عید بقرعید پر "آپا سلام" اور "دولھا بھائی سلام" کے صلہ میں اٹھنی اماں جی سے اور روپیہ ابا جی سے ضرور مل جاتا تھا اور دوسرے نوکروں کی طرح "بیگم صاحبہ" نہیں کہنا پڑتا تھا بلکہ آپا اور دولھا بھائی کہنے کا فخر حاصل تھا۔

کلو کی ماں جو یوں تیرے میرے در پر ماتھا گڑتی تھیں اس کی بھی ایک وجہ تھی وہ چاہتی تھیں کہ ان کا کلّو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو جائے اور وہ راج جو وہ میاں کے دم سے نہ کر سکیں، کلو کے دم سے نصیب ہو — اتنے بچے پڑھتے ہیں۔ ایک کلو بھی پڑھ جائیگا۔ مگر کلو کے سپرد ہزاروں ڈیوٹیاں تھیں۔ بچی کی کمر دبانی۔ دوپہر کو پیر کے انگوٹھے میں رسی کھینچنا۔ تجھے مجھے پانی پلانا۔ ایک دم سارے گھر ہی کو پیاس لگ جاتی۔ کلو کو ایک مشک پانی کٹورہ کٹورہ کر کے ڈھونا پڑتا۔ چبو اور چھابہ کے ساتھ کھیلنا۔ ہزار بار جھنجھنا گرائے تو اٹھانا چھابہ بی کی گڑیا کو ایک منٹ میں چھتیس بار ڈوپٹہ اڑانا۔ مہترانی سے پوتڑے دھلوانے کے لئے پانی ڈالنا۔ اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا جو کلو علم و ادب کی طرف رجوع کرتا۔ ویسے مولوی صاحب مفت کا اُلّو پڑھانے کے قائل بھی نہ تھے کلو بھی کپڑے بھی تو اس قابل نہ رہتے تھے کہ وہ سب بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکے۔

ہمارے ہاں باورچی تھا۔ اس لئے ماماگیری سے تو کلو کی ماں کو نجات ملی ہوئی تھی۔ مگر گیہوں پھٹکنا، دالیں بیننا۔ مسالے کوٹنا۔ بچوں کو نہلانا دھلانا جنس تلوانا۔ کسی کے ہاں بچہ ہو تو راتوں کو زچہ کے سرہانے جاگنا کہ کہیں بلی حرام خور نالی کی بسوند سے لگی چلی آئے اور بچہ کو چبا کے نہ رکھدے

کلو چند مہینے کا گود میں ہوگا کہ سناونی آ گئی۔ نہ میت اٹھی نہ جنازہ آیا نہ تربت بنی۔ بس ایک تار نے چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں۔ کانچ کی چوڑیوں اور دوپیسے مہینے کے گلابی فیروزی رنگ سے پیچھا چھوٹ گیا۔ جوان بیوہ

کس کو بجا دے۔ جہاں گئیں نکلنا پڑا۔ لڑھکتی پڑھکتی ہمارے ہاں آکر
دم لیا تھا تو کلو کی عشق بازی نے پیر اکھاڑ دیئے۔ دو چار پیغام بھی آئے
خود شوقین مزاج چھوٹے چچا نے ہاتھ صفا کرنے کی کوشش کی مگر کلو کی
ماں نے پھٹے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا۔

"نہ میا، میرا پوت جوان ہوگا تو کیا کسی کو منہ دکھائے گا کہ میا نے خصم
کرلیا۔" ویسے وہ چچا کی شادیوں کی لت سے بھی واقف تھیں۔ بیاہتا
بیوی پر تنبولن لا بٹھائی، تنبولن پہ لیساطن، اس پہ دھوبن، میراثن اور
بھنگن کا نزول ہوا۔ غرض میاں نے کوئی "بن" یا "تن" نہ چھوڑی اور
جب ان کی بیویوں میں جوتم بیزار بڑھتی۔ وہ ایک نئی پھلجھڑی لاکر چھوڑ
دیتے۔ ان کے حصے کے دالان میں یتیم خانہ کھلا ہوا تھا۔ کلو کی ماں میں
دم درود بھی نہیں تھا۔ پچیس برس کی عمر میں کھکھوڑائن ہو کر رہ گئی
تھیں۔ صورت پہ مکھیاں بھنکتی تھیں۔ ازلی رنڈاپا برستا تھا۔ آئے
دن نیم تلے کھٹیا پہ لحاف اوڑھے جوڑی بخار سے کشتی لڑا کرتیں ویسے
کوئی کام کی چیز کو کاہے کو بیاہے۔ مفت کی نوکرانی کسے بری
لگتی ہے۔

اسی شام انہوں نے بخار میں جھلستے ہوئے کلو کو کندھے سے
لگایا اور پڑوس میں نواب ممتاز کے شاگرد پیشے میں جا پڑیں۔

نواب صاحب کا بھرا پُرا گھر تھا۔ پڑھے لکھے فیشن ایبل لڑکے
لڑکیاں، بہوئیں۔ کوٹھی کے شاندار احاطے میں آئے دن ڈنر پارٹیاں

ہوئیں، اور اسی کوٹھی کے ایک گمنام سے کونے میں نواب صاحب پڑے زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ دو سال سے ان کی اب تب ہو رہی تھی مگر جا تو اللہ میاں سے پٹہ لکھا کر لائے تھے: اچھے بھلے جوان لڑھک جائیں پر بڈھا ٹس سے مس نہ ہو۔ ایک تو دنیا بھر کی بیماریاں جن میں پرانی پیچش اور گٹھیا پیش پیش۔ اوپر سے بڈھے کا دماغ ساتویں آسمان پر۔ منہ پر وہ مغلظات کہ کوئی نوکر آٹھ دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔ کلو کی ماں کے بھاگوں ان کا نوکر بھاگا ہوا تھا۔ لہٰذا سات روپے مہینہ اور کھانا اور سال میں دو جوڑ سوسی کے کپڑوں پر وہ نواب صاحب کی نرس کے طور پر رکھ لی گئیں ہمارے خاندان کی تو ناک کٹ گئی۔ نواب صاحب کے ہاں سے پہلے ہی لین دین بند تھا وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ اب تو اور بھی تن گئی

نہ جانے کلّو کی ماں کی تیمار داری نے رنگ دکھایا یا بڈھا صند باندھ رہا تھا، بجائے سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے اور مضبوط ہو گئی، بڈھا بد مزاجی کا ٹھیکیدار تھا۔ بیچاری سر جھکا کر ان کی گالیاں کو سنے سنا کرتی۔ کوٹھی میں قہقہے گونجا کرتے اور وہ بیٹھی بڈھے کی قے سمیٹا کرتی۔

اور پھر بڑے میاں کی گالیوں میں کمی آنے لگی۔ گلاس، رکابی مار پھینکنے کی عادت میں بھی کمی آگئی۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر سرہانے سے اکنّی نکال کر کلو کو دیتے "کیوں بے، کیا لے گا؟" وہ اس سے مذاق میں پوچھتے

"جی، روشنائی"۔

"روشنائی! ابے گھاس کھا گیا ہے؟ گجک منگیو، اچھا"۔

"جی اچھا" کلو سہمی ہوئی آواز میں کہتا۔

ایک دن کلو کی ماں نے منہ دھلا کر سلانچی اٹھائی تو بڑے میاں بڑی نرم آواز میں بولے۔

"کلو کی اماں تم میری پوتیوں کے برابر ہو۔ پر نامحرم ہو یہ گو موت کراتے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔ اب بڑھاپے میں مرتے وقت عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو نکاح کر لو۔"

کلو کی ماں سے سلانچی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی کوٹھری میں چلی گئیں اور دیر تک بے سُدھ پڑی رہیں پھر ایک دم جی بھر آیا۔ اور خوب بھڑاس نکالی ہائے مرنے والے، یہ تم نے کس قصور کی سزا دی۔

شام کو جب وہ بیڈ پین لے کر آئیں تو بڑے تکئے کے سہارے بیٹھے تھے۔ "مجھے حاجت نہیں۔ ابھی کریم آیا تھا۔ اس نے فراغت کرا دی۔" انہوں نے ذرا سوکھی آواز میں کہا۔ اور کلو کی ماں کا خون خشک ہو گیا۔ یا مولا! اب کتنی سیڑھیاں باقی رہ گئی ہیں۔ سر چکرایا اور دروازے سے ٹک گئیں۔

"سردے کی دو پھانکیں ذرا برف لگا کر لے آؤ" بڑے میاں اپنی روکھی کھردری آواز میں بولے۔ آنسو جھٹک کر کلو کی ماں سردے کی قاشیں لے آئیں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف بڑے میاں کی ڈھیلی بتیسی کی پچڑ پچڑ سنائی دے رہی تھی۔

بڑے میاں کچھ نادم، کچھ جھینپے سے سردے کے قتلے چکھتے رہے۔ کلو کی ماں کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

اتنے میں چق کے پیچھے سے کلّو کی آنکھیں چمکیں۔ ماں نے اشارے سے بھگانا چاہا۔ مگر بڑے میاں بولے۔

"آنے دو بچے کو۔" کلو دبا دبا آیا۔ اور گھبراہٹ چھپانے کو کبھی ایک پیر پر اور کبھی دوسرے پیر پر ڈگمگاتا رہا۔

"کچھ پڑھتا وڑھتا بھی ہے یا بس ڈنڈے بجاتا ہے۔" پاس بلا کر وہ کلّو سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کلّو کی ماں جب ان کی بتیسی دھو کر لائیں تو وہ بڑے میاں کو کچھ کا پہاڑا سنا رہا تھا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے۔ ماں کے اشارے پر کلو باہر جانے لگا تو بڑے میاں غرّائے۔

"ہم سو نہیں رہے ہیں کلیم الدین۔"

کلیم الدین ——— بڑے بڑے آنسو کلّو کی ماں کی آنکھوں میں بھر آئے کلیجہ سن ہو گیا۔ بس کلّو کا باپ یوں کلیم الدین لکھا کرتا تھا۔

"کلیم الدین کو پیار۔"

اُس کے آخری خط میں بھی تھا۔ پر اب تو وہ دنیا میں کلو ہی بن کر رہ گیا تھا۔ اور وہ اس گمنام سے کلّو کی ماں! ——— منہ پھیر کر جب وہ خالی رکابی اُٹھانے لگیں تو پھر گرجے

"ہم پہاڑا سُن رہے ہیں۔ دیکھیں پاجی کو کچھ یاد بھی ہے یا نہیں۔ تم سمجھتی تو چھ سیتے ہ؟"

"پیابیس۔" کلو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور کلّو کی ماں کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

بڑے میاں نے پھر نکاح کی بات نہیں چھیڑی۔ مگر کلو سے ان کی دوستی یارانے کی حد کو پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ ان کے بستر پر بیٹھنے لگا۔ دونوں دوپیتیا کھیلتے تو بڑے میاں خوب بے ایمانی کرتے اور کلو ان سے جھگڑتا ان کے بستر پر بیٹھنے کے لئے کلو کو کپڑے بھی صاف پہنانے پڑتے ویسے اب اسے کام کاج نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اتنا میلا بھی نہ ہوتا تھا۔

ایک دن تاش کھیلتے کھیلتے ایک دم بولے۔ "چودہ پنجے؟"

"اکیاسی"

"ایں!" بڑے میاں غرائے "کیا کہا؟ اکیاسی!۔ کریم خان، اس اُلو کے پٹھے مولوی کی داڑھی پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو۔"

جب مولوی صاحب آئے تو بڑے میاں ہنکارے۔

"سنئے مولوی صاحب! ہاں بھئی کلیم الدین، چودہ پنجے؟"

"اکیاسی" کلو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"سنا آپ نے مولوی صاحب؟ چودہ پنجے اکیاسی! بچے کو آپ اپنا سر پڑھاتے ہیں؟"

بڑے میاں نے مولوی صاحب کی گھنٹہ بھر ٹانگ کھینچی۔ پھر کلو کی ماں کی چار گھنٹے جان سولی پر کر دی اور اس دن سے مولوی صاحب بر آمدے میں بیٹھ کر کلو کو سبق دینے لگے۔ سنک سوار ہو جاتی تو بڑے میاں، مولوی صاحب اور کلو دونوں کا دھوبی گھاٹ کر دیتے۔

صاف ستھرے پوتوں نواسوں کو کہاں اتنی فرصت تھی جو اپنی نرسری اور

کنڈرگارٹن سے پراتے بیچش میں سڑتے ہوئے دادا میاں کے پاس آتے۔ کئی کئی دن گذر جاتے۔ کوئی پلٹ کر نہ پوچھتا۔ لوگ منتظر تھے، کب بڑے میاں مریں اور ان کا دھوم دھام سے چالیسواں ہو۔ پیار کا بھوکا کلو بڑے میاں کی سنسان بوڑھی زندگی میں تر و تازہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ دو پیار کے ترسے ہوئے ایک چھوڑ ہزار جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ گھنٹوں دونوں میں ایسے گھُل مِل کر باتیں ہوتیں، جیسے وہ ہم سن ہوں۔

"اے کلیم، فاختہ نے دانہ کھایا؟"

"نہیں ابا جی، چاول ویسے کے ویسے پڑے ہیں۔"

"اماں، گاودی ہو نرے۔ فاختہ چاول پر منہ نہیں ڈالے گی۔ اسے کودوں دو" اور دونوں سر جوڑ کر فاختہ کو کودوں کھلاتے۔ وہ ایک دانہ کھا لیتی تو بڑے میاں کا چلّوؤں خون بڑھ جاتا۔

اور ایک دن بڑے میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب کلو کی ماں نے انہیں لاٹھی کے سہارے دوسرے ہاتھ سے کلّو کا کندھا پکڑے صحن میں کیاریوں کے پاس دیکھا تو کلیجے میں گولی سی لگی۔

کوٹھی میں بم پھٹ پڑا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رات کو دادا میاں نے کلو کی ماں سے نکاح پڑھوا لیا۔ بیس ہزار مہر نقد بنک میں اور نہر والی کوٹھی جس کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کرایہ آتا تھا۔

"میں تو کہتی تھی، وہ ایک حرّافہ ہے" بیچی بی نے کہا۔ حالانکہ یہ پیش گوئی انہوں نے اسی دم گھڑی تھی۔

ہفتوں کلو کی ماں اور دادا میاں کے چرچے محلے والے نمک مرچ لگا کر کرتے رہے۔ ایک شاعر قسم کے نوجوان نے تو ان پر نظم تک کہہ ڈالی۔ خاندان والوں کی لے دے سے تنگ آکر بڑے میاں نے اپنی طرف کے دروازے میں اینٹیں چنوا دیں۔ سب کی محبت پھر پھڑا کے جاگ اٹھی اور لاوارث بڈھا سب کا چہیتا بن گیا۔ مگر ضدی بڈھے کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں کلو کی ماں کے جادو میں آ کر رہی سہی جائداد نہ دے ڈالے۔ اور مفت کے عیش میں چنگاری پڑ جائے۔

نکاح کی رات جب رفع حاجت کے بعد تیسی دھو کر گلاس میں ڈال کر سرہانے رکھنے گئیں تو وہ اور کلو دو معصوم بچوں کی طرح گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے۔ مچھر دانی درست کر کے کلو کی ماں برآمدے میں اپنی مخصوص پلنگڑی پر لیٹیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ ایک چھتنار برگد کی چھاؤں میں لیٹی ہیں۔ بے اختیار کانوں میں اپنی بارات کے تاشے تڑ تڑانے لگے۔ انار پھلجھڑیاں چھوٹ کر دماغ میں جگنوؤں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ مانجھہ، چوتھی، بری ایک ایک کر کے ذہن کی پگڈنڈی پر گذرنے لگیں۔ عمر ہی کیا تھی۔ رحیم بھی تو کم سن ہی تھا۔ مہندی سے لال ہاتھ کئی دن یاردوستوں سے چھپائے پھرا تھا اور پھر گھر کی اندھیری کوٹھڑیوں اور سنسان چھتوں پر وہ جوان ہوئے۔ پھر کلو تے ان کو لنوں کھنڈوں کا بھانڈا

پھوڑ دیا۔ مگر بنتے ہی دنیا اجڑ گئی۔

کلو کی ماں کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ مرنے والے کی جوان چوڑی چکلی چھاتی سانس روکنے لگی۔ تھکے ہارے مسافر کی طرح کلو کی ماں نے اس غیر مرئی چھاتی پر ماتھا ٹکا دیا۔ جو سنگ مرمر کی طرح سرد اور بے جان تھی۔ ایک انجانی گولی اس چھاتی کو چیرتی ہوئی معصوم کلو اور بدنصیب ماں کے وجود کو پاش پاش کر گئی۔

نیند

ایک دم رات انتہا سے زیادہ سنسان اور تھکی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ وہی رات جو چند گھنٹے پہلے نشے میں چور، چوتھی کی دلہن کی طرح جگر مگر کر رہی تھی۔ یکایک بوڑھی اور مریضہ بن گئی ـــــ انہوں نے اپنے بازو پر سوئے نوعمر جوان کے بھاری سر کا بوجھ ذرا کھسکا کر، اور قریب کر لیا وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی سڈول ٹانگیں مسہری سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ پہلو کے نیچے مڑا ہوا تھا۔ دوسرا بھاری شہتیر کی طرح ان کے سینے پر پڑا ہوا تھا۔

کیا جی لگا کر سو رہا تھا نیک بخت! اگر اس کی سرمئی آنکھیں اس وقت کھلی ہوئی ہوتیں تو کھنتئی بالوں کے گچھے اس کی پتلیوں پر ٹک جاتے اس کے صندلی گالوں پر نصف رات کی سبزی جھلک آئی تھی۔ لب وا

تھے اور وہسکی کی میٹھی میٹھی مہک آ رہی تھی۔

نوعمر لڑکا سو رہا تھا اور وہ جاگ رہی تھیں۔ اس کی گہری نیند پر انہیں شدت سے رشک آ رہا تھا۔ ان کے بازو پر سر رکھتے ہی وہ فوراً سو گیا تھا اور خراٹے لینے لگا تھا، بالکل دودھ پیتے بچے کی طرح اس کے خراٹے نرم و نازک اور غنودگی کے سُروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے شانوں پر مسلسل وقفے سے ایک ہلکی سی گرم لہر رینگ جاتی تھی۔

وہ جاگ رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے جسم سے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ کتنا دور تھا، کتنے سال درمیان میں گہری گہری کھائیوں کی طرح حائل تھے اور وہ زندگی کی سنگلاخ ترین چٹان پر معلق تھیں۔ نوجوان سپاہی ان سے دُور خوابوں کی دنیا میں اپنی ڈارلنگ شہنو کو بانہوں میں جکڑے اس کے ہونٹ چوم رہا تھا اور ان کے برباد — اور سنسان دل کو اس نیند کی دنیا سے دور اکیلا چھوڑ گیا تھا۔

ان کی نیند کا خزانہ ختم ہو چکا تھا۔ برسوں سے وہ لوٹ پوٹ ہو کر سونے کا مزا بھول چکی تھیں۔ اب تو نیند کی دواؤں کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی سختی سے انہیں گولیوں کی مقدار گھٹانے کی تاکید کی تھی۔ کبھی وہ دن بھی تو تھے جب ان پر الغاروں نیند ٹوٹ پڑا کرتی تھی۔ جاگنے کے لئے چائے اور کافی بھی بے کار ثابت ہوتی تھیں۔ گیارہ بجے سے ہی ان کی آنکھیں لڑکھڑانے لگتی تھیں۔ ایک بار تو وہ

رقص کے درمیان میں اپنے پارٹنر کی باہنوں میں چند لمحوں کے لئے غافل ہو گئی تھیں۔ اگر ان کا پارٹنر اتنا قوی ہیکل نہ ہوتا تو وہ انہیں یوں باہنوں میں اٹھائے اٹھائے ہرگز رقص نہ کر پاتا۔

اور اگر انہیں اپنے پارٹنر کی یہ جواں مردی اداسے طرح نہ بھا گئی ہوتی تو شاید آج ان کی زندگی بالکل مختلف دھاروں میں بہہ رہی ہوتی۔ یہ جب کی بات تھی جب ان کی شادی کو چند ہی سال ہوتے تھے اور جب تک ان کے شوہر اتنے باسی اور پرانے نہیں ہوئے تھے۔ یہ دونوں سوسائٹی میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے زندہ دل لوگوں نے بڑے جوش وخروش سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ نئے بیاہے سلمان اور شہنو کی جوڑی بھی خوب تھی۔ سلمان سبک قد کے حسین وجمیل نوجوان تھے۔ ان کی آنکھوں میں معصومیت تھی، آواز میں سحر تھا سوسائٹی کی اکتائی ہوئی بیگمیں بہت جلد ان کی بھولی بھالی صورت پر لٹو ہو گئیں۔ شہناز جنہیں سب پیار سے شہنو کہا کرتے تھے بڑی البیلی واقع ہوئی تھیں اگر ان کا ناک نقشہ حسن کے مقررہ پیمانے سے تولا جاتا تو بڑے گھاٹے میں رہتیں۔ مگر ان کی پرسنیلٹی غضب کی تھی۔ "راٹ" کی فراوانی تھی۔ لانبے قد میں بلا کی لچک تھی۔ ایک تو جسم کا نوبہ شکن اتار چڑھاؤ اوپر سے اُن کا انوکھا ٹیسٹ فٹنگ لباس، سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔

اُف وہ بھی کیا دن تھے۔ جب لوگوں کی نگاہیں ان کے تعاقب

میں بھڑکا کرتیں۔ کچھ حاسد قسم کے لوگوں کا خیال تھا کہ سلمان صاحب کو شہنو ڈارلنگ کی بدولت ہی اتنی ہردلعزیزی حاصل تھی۔ کچھ احمق سمجھتے تھے کہ خوش مذاق خواتین سلمان کی وجہ سے شہنو سے بہناپا جتانے میں پیش پیش تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نیند لوٹ کر آتی تھی۔ سرِشام ہی سے آنکھیں میٹھی میٹھی ہونے لگتی تھیں۔ تب ان کا حسن دوبالا ہو جاتا اور لوگ انہیں کسی شرط پر اٹھنے نہ دیتے۔ پارٹیوں سے آکر کیسی دھواں دھار نیند آتی تھی سلمان تو صبح دفتر چلے جاتے وہ نرم نرم بستر پر مچل مچل کر سوئے جاتیں۔ بمشکل کھانے کے وقت پر اٹھتیں۔ پر نیند کھٹکے جاتی۔ آنکھیں نڈھال ہوئی جاتیں۔ نہا دھو کر ذرا کی ذرا آنکھیں کھلتیں پھر تھوڑی سی دیر کے ساتھ کھانا کھاتے ہی جسم کے جوڑ جوڑ میں نیند رینگنے لگتی۔ پڑھنے کی کوشش کرتیں تو کتاب بار بار منہ پر گرنے لگتی۔

پر اب جیسے نیند کی تھیلیاں ہی سوکھ گئی ہوں۔ وقت شیطان کی آنت بن کر ہولے ہولے سرکتا --- اور نیند نہ آتی۔ آتی بھی تو ایسی اچٹتی ہوئی بیگانی سی کہ سو کر بھی بے خوابی کا کھردرا احساس طاری رہتا۔

ان کا ہاتھ دب جانے سے دورانِ خون رک کر سن ہو گیا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے نیند سے بوجھل سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچا۔ شہتیر جیسے بازو کو جسم کی طاقت لگا کر سرکایا اور کہنی کے بل ہو کر وہ ملازی کے نوجوان کو تکنے لگیں۔ ان ہنگامہ خیز چند گھنٹوں میں اچھی طرح اس کے نقش و

نگار کو بھی نہیں دیکھ پائی تھیں۔ وہ تھا بھی بیکل بوٹی۔ جوانی اس کی رگ رگ میں قلانچیں بھر رہی تھی۔ نچلا بیٹھتے اسے تھکان ہونے لگتی تھی۔ انہوں نے زندگی میں بڑے بڑے شرابی دیکھے تھے ـــ ہنستے ہوئے، روتے ہوئے۔ الٹیاں کرتے ہوئے۔ کپڑوں میں رفع حاجت کرتے ہوئے مگر ایسا شرابی انھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جتنی وہ چند گھنٹوں میں پی گیا، دوسرے کئی دن میں نہ پی پاتے۔ پھر لطف یہ کہ نہ پیروں میں لرزش، نہ زبان میں لکنت ـــ ان کا جوڑ جوڑ ٹوٹ گیا۔ مگر وہ چاق چوبند رہا پیتا رہا، رقص کرتا رہا۔ اس ایک شام اس نے نہ جانے کتنے میل رقص کر ڈالا ہوگا ـــ!

شروع ہی میں وہ اتنا پئے ہوئے تھا کہ انہوں نے مسز دوراب جی سے کہہ کر ہی اس جنگلی سے بچنا چاہا۔ اس بھوت سے تو کوئی سانڈنی ہی نپٹ سکتی تھی۔ مگر بدقسمتی کہ وہ دوسری خواتین پہلے ہی مشغول تھیں ورنہ اس چھوکرے کے لئے تو بقول مسز دوراب جی انہیں الٹے دام مل جاتے۔ پھر تھوڑی دیر جبراً بھگتنے کے بعد انہیں اس پر پیار آگیا۔ وہ اکیلا تھا بہت ہی اکیلا تھا۔ اس کی ماں بچپن میں مر چکی تھی اور باپ الو کا پٹھہ تھا۔ دوسرے اسے شہنو سے پیار ہو گیا تھا۔ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔ وہ نوکری چھوڑ دے گا۔ ساری دنیا کو گولی مار دے گا۔ بس وہ اور شہنار ساری عمر یوں ہی چکنے فرش پر ناچتے رہیں گے۔ یہ فیصلہ اس نے چند گھنٹوں کے بعد ہی کر لیا تھا۔

جھک کر انہوں نے کھڑکی میں سے آتی ہوئی صبح کاذب کی دودھیا روشنی میں نیند میں متوالے نوجوان کو ایک بار پھر دیکھا۔ سوتے میں اس نے پٹ کر سوتے ہوئے بچے کی طرح سسکی بھری جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ محاذ سے زندہ سلامت آنے والے بھی اپنی روح کا کوئی نامعلوم سا حصہ وہیں خاک اور خون میں تڑپتا چھوڑ آتے ہیں اور جب نیند کی رانی انھیں بے دست و پا بنا کر خواب میں وہیں گھسیٹ لے جاتی ہے۔ تو وہ معصوم بچوں کی طرح بسورنے لگتے ہیں۔

"فرید بھی تو سوتے میں یوں ہی بسور دیا کرتا تھا—" انہوں نے سوچا

فرید کی یاد بجلی بھری تلوار کی طرح چمک کر دل میں ترازو ہو گئی۔ وہ کتنی کم سن تھیں جب فرّو پیدا ہو گیا تھا۔ کیا گندا سا لال بوٹی جیسا کہ دیکھ کر ابکائی آ گئی تھی۔ پلپلے تتلی کے کیڑے کو دیکھ کر ہی ان کا جی متلانے لگا تھا۔ ویسے بھی فرید کی آمد ہی ان کی سوشل لائف کے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوئی۔ ڈنر پارٹیوں میں پیٹ پھلائے کیسے جائیں۔

کتنا جھوٹ بولتے ہیں یہ دنیا والے کہ جب بچہ ماں کی چھاتی منہ میں لیتا ہے تو روم روم میں مامتا جاگ اٹھتی ہے۔ انہیں تو ایسی تکلیف ہوئی تھی کہ چیخیں نکل گئی تھیں۔ پھر لاکھ نرسوں نے کوشش کی۔ انہوں نے بچے کو جسم سے نہ چھونے دیا۔ فرق ہی کیا پڑتا تھا۔ وہ تھا ہی کمزور۔ اپنے باپ پر گیا تھا۔

فرد ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکا۔ امی جانی اسے اپنے ساتھ رامپور لے

گئیں - سچ پوچھیے تو وہ ان کا ہی بیٹا لگتا تھا۔ اتنی سی عمر میں ماں بن گئیں تھیں۔ مگر یہ کردار ان پر قطعی نہ سجتا تھا۔ اُنھیں اس سے امّاں کہلواتے بھی عجیب سا لگا اور جب وہ شہنو کہتا تو بیٹے کے مُنہ سے اپنا پیار کا نام سن کر انہیں اس پر کچھ کچھ۔ پیار آنے لگا تھا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب تک نیند اُن سے نہیں روٹھی تھی - اسی ہرجائی نیند نے ایک دن رقص کے بیچ میں ان کی بدمست انکھڑیوں میں سما کر انھیں ان کے پارٹنر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ وہی مضبوط بانہوں والا پارٹنر تھا - اس کا کہنا تھا کہ وہ انھیں باہر گھاس پر لٹانے گیا تھا - ویسے اس کی نیت کچھ زیادہ بد نہ تھی۔ مگر اتنی سی بات پر سلمان صاحب جذباتی ہو گئے ورنہ وہ اُن کے پارٹنر کا جبڑا نہ توڑ بیٹھتے - وہ اتفاق سے ان کا افسر اعلیٰ بھی تو تھا - اگر ایک افسر اعلیٰ از رہِ کرم اپنے ماتحت کی بیوی کو جو رقص کے، درمیان لمبی تان لینے پر مصر ہو . . . . . گھاس پر لٹا رہا ہو تو وہ جبڑا اُکھڑوانے کا ہرگز مستحق نہیں - ہر ایک جانتا ہے کہ کسی کو گھاس پر لٹاتے میں کیسے کیسے آسن مارنا ہی پڑتے ہیں - اگر سلمان نے اتنے چھچھورپن سے اپنی حماقت کا اس قدر شاندار ثبوت نہ دیا ہوتا تو شاید بات آگے نہ بڑھتی اور اُنھیں باس کی ضرورت سے زیادہ دلجوئی نہ کرنی پڑتی۔

باس یعنی مسٹر وین توہی ہیکل تو تھے مگر قطعی گوریلے کی طرح حسین تھے کالے بھجنگ! بالکل چھ کھونٹے تمباکو کے پنڈے کی شکل کے - ان کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ انسان کے آباد و اجداد بندر تو تھے - مگر اُن کا گینڈے سے بھی کوئی

ناطہ رہا ہوگا۔ بڑے بڑے کان —— سلمان سے قد میں ایک دو انچ کم ہی ہوں گے۔ مگر چوڑان میں دو ڈھائی گنا۔

شہناز کو بدصورتی سے ہمیشہ گھن آتی تھی۔ مگر یہ کالا دیو سبز پری کو نہ جانے کیوں بھا گیا تھا۔ ویسے شہناز کے خرچے زیادہ، آمدنی کم تو ہمیشہ سے تھی۔ فلیٹ بھی مسٹر دین کی عنایتوں کی بدولت مل گیا تھا۔ سوسائٹی میں ساکھ قائم رکھنے کے لئے دعوتیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ کپڑے لتے کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ پینے پلانے میں بھی خاصا خرچ آجاتا تھا۔ ان کے پاس زیادہ تر جہیز کی ساڑیاں تھیں یا اماں جانی بھیجتیں رہتی تھیں۔ مگر عموماً اپ ٹو ڈیٹ نہ ہوتی تھیں۔ دوسرے مسٹر دین میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ وہ ان کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھل جاتی تھیں۔ انھیں پیار کرنے کے طریقے آتے تھے

اس کے علاوہ اس معاملے کو بڑھانے چڑھانے میں کچھ سلمان کا بھی ہاتھ تھا۔ ان کی عاشق مزاجیاں اپنی جگہ کچھ کم نہ تھیں۔ حلیمہ دین ان کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ انھیں کی سفارش سے اتنی مزے دار نوکری ملی ہوئی تھی جس میں دعوتیں اور پکنکیں زیادہ اور کام بالکل نہیں کے برابر۔

جب فرید ہونے والا تھا تو سلمان صاحب اپنے باس کی بیگم کی تنہائیاں دور کیا کرتے تھے۔ کیونکہ دین صاحب یورپ کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے انھیں فرید سے پہلے ہی چڑ ہو گئی تھی اور ان کی مامتا جاگ نہ سکی۔ اگر وہ پیٹ میں نہ ہوتا تو حلیمہ دین سلمان کو ہل اسٹیشن نہ لے جا پاتیں اچھی طرح سے زچہ خانہ کی زردی بھی نہیں مٹی تھی کہ سلمان انہیں امی جان کے

سپرد کر کے خود اپنے باس کی گرمی سے اکتائی بیگم کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔
"ڈارلنگ، یہ سب نوکری کی خاطر کرنا پڑ رہا ہے"۔ انہوں نے سمجھایا تھا۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اور انتقاماً مسٹر دین کے آتے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ امی جان کو ہمیشہ سے سلمان سے چڑ آتی تھی ایک تو ان کی تنخواہ شہناز جیسی لڑکی کے اسٹینڈرڈ کی نہ تھی۔ دوسرے گدھے نے شہنو کو اس پھرتی سے ماں بنا ڈالا کہ بچی کو ذرا بھی کھیلنے کا موقعہ نہ ملا۔ لے دے کر ان کی ایک ہی تو اولاد تھی مگر وہ بھی اتنی بدھو کہ سلمان کی خالی خولی چاپلوسی میں آ کر راجوں اور مہاراجوں کے پیغامات ٹھکرا دیئے۔ اشاروں کنایوں میں انہوں نے شہناز کو قائل کر دیا کہ حلیمہ اور دین کی ویسے بھی نہیں بنتی۔ بہترین موقع ہے۔ اگر بات بن جائے تو دلدّر دور ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جان بوجھ کر وہ فرو کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ آہ! فرو ـــــ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کی لمبی ٹانگیں بھی اس سوئے ہوئے فوجی کی طرح قطعی مسہری سے باہر نکل آتیں۔ مگر فرو کی ٹانگوں کے نصیب میں مسہریاں نہیں، برما کے جنگلوں کی دلدل تھی۔

مگر شبانہ کی پیدائش پر ایک دم اس کی مامتا جاگ گئی۔ اس سے انھیں قطعی کوفت نہ ہوئی۔ حالانکہ فرید کے مقابلہ میں وہ نہایت بھونڈی اور بد وضع تھی۔ مسٹر دین کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ امّی جان کا خیال تھا اگر بیٹا ہوتا تو شاید وہ پگھل جاتے۔ مگر وہ تو دولت بنانے میں

ایسے مشغول تھے ۔ کہ انہیں کسی سے شدید محبت کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی ۔ شہناز نے بہت چاہا تھا ۔ کہ وہ اپنی بیگم کو طلاق دے کر اُن سے شادی کر لیں ۔ مگر وہ اس اسکینڈل کے لئے تیار نہ ہوئے ۔ ان کی بیوی ان کے بزنس میں نصف کی ساجھے دار تھیں ۔ سارا روپیہ بھی ان کے قبضے میں تھا ۔ ویسے دونوں کی اب بھی بڑی سلجھی ہوئی دوستی قائم تھی ۔ ایک کو دوسرے کے نجی معاملات پر کوئی اعتراض نہ تھا سوسائٹی میں وہ اب بھی میاں بیوی کی حیثیت سے ایک باوقار مقام رکھتے تھے ۔ سرکاری و نیم سرکاری دعوتوں میں وہ کبھی شہناز کو نہیں لے گئے ۔ وہ ان کا نجی معاملہ تھا اور نجی معاملہ ہی رہا ۔ سلمان کو تو اعتراض نہ تھا ۔ مگر انہوں نے خود ہی شبانہ کا بار ان کے کندھوں پہ نہ ڈالا ، اور نہ وہ اسے اپنی نظروں سے دور رکھ سکیں ۔ انہوں نے اس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی نرس مقرر کر دی تھی اور اسے ایک شان دار ہوٹل میں رکھتی تھیں ۔ جس کا خرچہ بڑی دریا دلی سے دین برداشت کرتے تھے اور جب وہ سب سے چھپ چھپا کر عورتوں کی طرح اپنے کلیجے کی ٹکڑی کو سینے سے لگانے ہوٹل جاتیں ۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی سنسنی خیز ناول کی بدنصیب مگر رومینٹک ہیروئن ہیں وہ اسے گود میں لے کر روتیں ۔ عام طور پر اس دردناک سانحہ کی خبر دین تک پہنچ جاتی اور وہ اشک شوئی کے لئے ساڑھیوں کے بنڈل بھجوا دیتے ۔ مگر ان کے آنسو پھر بھی نہ تھمتے ۔ آہ ، ظالم سماج نے انہیں اپنی بچی سے

جداگر رکھا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی کو اعلانیہ چوم بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اس کے گرد ایک دردناک المیہ تیار کر لیا تھا۔ جس کی ہیروئن بنکر وہ خود کو نہایت رومینٹک نظر آتیں۔

مگر ان میں درمیانہ درجہ کی بہت سی کوتاہیاں باقی تھیں۔ مسٹر اور مسز دین کی طرح وہ اپنے شوہر سے پرخلوص تعلقات قائم نہ کر لیتیں۔ اور نہ وہ حلیمہ دین سے خندہ پیشانی سے پیش آسکیں۔ جب بھی یہ دونوں جوڑے کسی پینے پلانے کی محفل میں اکٹھے ہو جاتے۔ دو چار ہی پیگ کے بعد جلی کٹی باتیں شروع ہو جاتیں۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی بھیانک بات نہ تھی۔ عورتیں جیسے ڈوپٹہ بدل کر ایک دوسرے کی بہن بن جاتی ہیں۔ اسی طرح حلیمہ اور شہناز شوہر بدل بہنیں تھیں۔ شریف بیویاں ایسے موقعوں پر ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو کر اچھی بھلی فضا کو مکدر نہیں کیا کرتیں۔

پھر ایک دن حالات نے قلابازی کھائی مسٹر دین اور مسز دین میں ایک دم ملاپ ہو گیا اور وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا بزنس ایک سندھی کے ہاتھ بیچ دیا جس کا اکاؤنٹ انگلستان میں تھا۔ کچھ الٹ پلٹ کے بعد دین فیملی نے ہجرت ہی میں بہتری سمجھی، نئے باس نے مسٹر سلمان کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ اور پلک جھپکاتے میں شہناز اور ان کے شوہر پتھریلی بنجر زمین پر ایڑیاں رگڑتے نظر آئے۔

کیا قیامت کا وقت تھا۔ چھ مہینے کا فلیٹ کا کرایہ نہیں دیا تھا۔

دوست احباب سب مسٹر دین کی دی ہوئی نوکری سے بنے تھتے وقت بگڑا تو وہ بھی پھر سے غائب ہو گئے۔ اس وقت اگر مسز دوراب جی نے جو اپنے مرحوم شوہر کی شراب کی دوکان کو بڑی مستعدی سے چلا رہی تھیں آکر ڈوبتی ناؤ کو اپنی دولت کے چھینٹوں سے سہارا نہ دیا ہوتا۔ تو نہ جانے کیا ہوتا۔ مالا بار ہل پر ان کا شاندار فلیٹ تھا۔ اس پر کچھ پولیس کو اعتراض ہونے لگا۔ وہ فلیٹ انہوں نے پگڑی پر دیدیا۔ اور خود شہناز کے فلیٹ میں ایک کمرہ لے کر رہنے لگیں انہوں نے حالات کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد چھ مہینے کا کرایہ ادا کر دیا۔ ایک کمرہ چھوڑ کر سارے فلیٹ پر قبضہ ہو گیا۔ اس عرصے میں سلمان کے زخمی دل پر خورشید سہانے مرہم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ سہنا ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں باز پائلٹ کی موت مر کر اپنی غمگین بیوہ کے لئے اچھی خاصی پنشن کا انتظام کر کے گیا تھا۔ مسز دوراب نے ایک کمرہ فلیٹ میں اسے دے رکھا تھا۔ کچھ دن یہ انوکھا خاندان بڑے مزے سے رہا۔ سلمان اور خورشید کی جوڑی بن گئی۔ مسز دوراب جی شہناز کو بڑی دلچسپ ہستیوں سے متعارف کرانے لگیں۔ کبھی افسران کے غول بوتلوں کے بکس لے کر آجاتے۔ کبھی جہازی قہقہے لگاتے آن موجود ہوتے۔ بعض کے ساتھ خواتین بھی ہوتیں۔ کچھ کو مسز دوراب جی کی سہیلیاں سنبھال لیتیں۔ خوب قہقہے چلتے۔ ریکارڈ لگا کر ڈانس کئے جاتے۔ چوما چاٹی سے آگے بات نہ بڑھتی۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی کوئی جوڑا اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے

غائب ہو جاتا۔

اور یوں دن گزرتے رہے —— زندگی چلتی رہی۔ خورشید اور سلمان کی بڑی جانی پہچانی سی دوستی تھی۔ اگر وہ شادی کر لیتی۔ تو پنشن بند ہو جاتی خو خاصی معقول تھی۔ اور سلمان کھرا عشق کرنا جانتے تھے۔ گرہست بنانا ان پر ظلم کرنا تھا۔ جب سے نوکری چھوٹی تھی۔ خورشید ہی ان کا خرچ اٹھا رہی تھی۔

یہ خورشید کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے لئے پنشن کا انتظام کر کے مرا تھا، مگر شہناز کا تو کوئی سہارا نہ تھا۔ امی جان نے فرو کو لائق فائق بنا دیا تھا۔ شبانہ کا ہوٹل کا خرچہ اب قابو سے باہر ہو چکا تھا المیہ بھی کچھ باسی ہو چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے امی جانی کے سپرد کر دیا تھا۔ کچھ رقم جو مسٹر ڈین چلتے چلتے انہیں تھما گئے تھے۔ وہ تنہائی اور وحشتِ دل دور کرنے کے سلسلے میں ختم ہو گئی۔ کچھ مسز دوراب جی کی شراب کی بوتلوں میں گئی۔ کچھ ریس کورس پر ڈوبی بمبئی جیسے شہر میں چند ہزار کی حیثیت ہی کیا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب فرو کی اچانک موت نے انہیں اوندھے منہ گرا دیا تھا۔ نہ جانے اتنے دن کی سوئی مامتا کیوں ایک جھٹکے سے جاگ اٹھی۔ فرو کے رخصت ہوتے وقت وہ ایلورا، اجنٹا کا فن ملاحظہ کرنے اپنے دوستوں کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ جدائی کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ مگر موت نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ مہینوں وہ گم رہیں۔ اگر ایک لمحہ کو بھی انہیں ہوش

آجاتا تو پاگل ہونے لگتیں۔

فرد کے خیال پر وہ ایک دم ماضی کی دم گھوٹنے والی فضا سے لوٹ آئیں۔ پہلو میں پڑے ہوئے نوجوان نے ایک لمبی چوڑی کروٹ لی اور چاروں ہاتھ پیر پھینک کر پھیل گیا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی کچھ اور دودھیا ہو گئی تھی۔ اس کا سڈول جسم ساری مسہری پر قابض تھا۔

"شہنو ڈارلنگ —— مائی سویٹ بے بی ——" اس نے ان کے کان کی لَو چباتے ہوئے ان سے شادی کی درخواست کی تھی اس کے کھولتے ہوئے الفاظ سانپ کی پھنکار کی طرح اب تک ان کے کانوں میں رینگ رہے تھے۔

شادی!

ایک ایک کر کے نہ جانے کتنے برسوں کا بوجھ ان کے کاندھوں سے سرک گیا تھا۔ انہوں نے سسکی بھر کر خود کو اس کی کڑیل باہوں میں لے سدھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت تھک گئی تھیں۔ اگر کچھ دن اور نیند نہ آئی تو ان کی ہستی بارود کے ڈھیر کی طرح بھک سے اڑ جائے گی۔ کتنی وسعت تھی نوجوان کے چوڑے سینے میں! اس کی تازگی کے سائے میں ان کی خشک ہستی لہلہا اٹھے گی۔ انہوں نے تھکے ہارے مسافر کی طرح نڈھال ہو کر اپنا منہ اس کے چٹیل سینے پر ٹکا دیا اور ننھی سی یتیم بچی کی طرح سسکنے لگیں فوجی جوان نے سوتے میں جیسے کتے کو پچکارا۔

"بے بی، بے بی —— ہنی چ —— مائی سویٹ بے بی ڈارلنگ!"

وہ پھر بڑبڑایا اور دوسرے لمحے خوابوں کی دنیا میں چوکڑیاں بھرنے لگا۔
ان کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ آنکھوں میں بھوبل کھٹک رہی تھی۔ دل ایک بھٹکے ہوئے پنچھی کی طرح پھڑک رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور آنسو بہاتی رہیں۔

وہ اس ہنگامے کی تنہائی سے گھبرا چکی تھیں۔ فلیٹ قہقہوں سے گونجا کرتا مگر ان کے دل کی ویرانی اور بڑھتی جاتی۔ مسز دوراب جی نہ جانے کہاں سے مغربی سیاحوں کے غول کو گھیر لاتیں۔ جب سے شراب بندی کا قانون بنا۔ تب سے فلیٹ ایک نہایت شائستہ قسم کا قحبہ خانہ بن گیا تھا۔ جہاں گاہک بطور دوستوں کے آتے، پرمٹ کی شراب تو پہلے ہی حملے میں ختم ہو جاتی پھر مسز دوراب جی کی بوتلیں کھلتیں اور داد عیش دی جاتی۔

کئی بار انہوں نے اکتا کر شادی کرنی چاہی، ایک جان چھوڑ، ہزار جان سے عاشق ہوئیں۔ اپنا تن من دھن سب لٹا دیا۔ مگر شکار ہمیشہ رسیاں تڑا کر بھاگ نکلا۔ اور جب کوئی یوں انہیں جل دے کر نکل جایا کرتا تو ان پر پھر مردنی کے دورے پڑنے لگے —— پرانی پیچش عود کر آئی۔ خون کا دباؤ گر جاتا۔ اور وہ ٹوٹتے ہوئے دل کو جوڑنے کے لئے شراب کا سہارا لیتیں۔ ایسے موقعوں پر مسز دوراب جی ان پر خوب خوب چھینٹے کستی ایک دفعہ تو اس نے انہیں اتنا سلگایا کہ جوتی لے کر انہوں نے اس کا بھیجا نکال دیا۔ وہ بھی غصے میں اکڑ چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شہناز میں ایک عظیم الشان انقلاب واقع ہوا۔ ان کی ملاقات ایک جبروت قسم کے انقلابی شاعر

سے ہو گئی اور وہ بڑے شدومد سے ملک میں انقلاب لانے پر تل گئیں۔ حرام بچی کی ماں کی حیثیت سے وہ خود کو بے انتہا انقلابی سمجھتی تھیں۔ آرٹ اور کلچر کی خدمت کے سلسلے میں انہیں فرداً فرداً کئی فنکاروں پر عاشق ہونے کا موقع ملا۔ مسٹر دین کی عطا کی ہوئی ساڑھیاں بالکل بے کار ہو گئیں۔ اُن دنوں انہوں نے نہایت باعیانہ اور میلی ساڑھیاں پہن کر واقعی مزدوروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس ماحول میں نہ تو انگریزی شراب کچھ سجتی اور نہ آسانی سے مہیا کی جا سکتی تھی لہٰذا انہوں نے نہایت سستی دارو پر دست شفقت پھیرنا شروع کر دیا۔

اُف، کیا ہنگامہ خیز دن تھے وہ بھی! میلے میلے فن کاروں سے ان کا فلیٹ کھچا کھچ بھرا ہوتا۔ سینتے سڑتے کی بو سے فضا بس جاتی ـــــ تب علم و ادب، فلسفہ اور شاعری پر مباحثے ہوتے جو عموماً جوتم پیزار پر ختم ہوتے۔

مگر جلد ہی انہیں قائل ہونا پڑا کہ ننگے بھوکے فن کاروں کی صحبت میں روحانی غذا کی فراوانی ہو سکتی ہے مگر مکان کا کرایہ اور گھر کا خرچہ اگر ان کی کھال بھی اتار لی جائے تو بھی نہیں چل سکتا۔ مجبوراً انہوں نے پھر مسز دوراب جی سے میل کر لیا۔ وہ شاید منتظر ہی بیٹھی تھی۔ فوراً راضی خوشی من گئی۔ اس نے اجڑے ہوئے فلیٹ کو دوبارا سنوارا پھر وہی صوفی قسم کے دوست اور ولایتی شرابیں چلنے لگیں سیاحوں کے جھمگٹے رہنے لگے۔

اور یہ شمالی ہند کا گبرو اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

آنسوؤں کی چلمن میں سے انہوں نے نیند کے ماتے جوان کو دیکھا۔ اس کی ناک اور اوپر کے ہونٹ پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں ہیرے کی کنیوں کی طرح دمک رہی تھیں۔ انہوں نے جھک کر اپنے سرد اور باسی ہونٹ اس کے دہانے کے کونے پر رکھ دئے۔ جہاں جاگنے میں ایک ننھا سا گڑھا مسکرانے لگتا تھا۔

پو پھٹنے لگی تھی — کوئی دم میں سورج کی بے رحم سلاخیں، ان سوئی ہوئی انکھڑیوں میں چبھنے لگیں گی اور فوجی جوان جاگ پڑے گا انہوں نے ایک بار جی بھر کے لاڈلے کو دیکھا اور اس پر چادر ڈالدی۔ ایک لمحہ کو پلک جھپکائے بغیر وہ تھکے ہوئے جسم کو گھسیٹ کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

آئینے میں وہ اپنے چہرے کے ویران کھنڈروں کو دیکھ کر لرز اٹھیں اس کے جاگنے سے پہلے مرمت کرنا ہوگی۔ وہ دبے پیر کمرے میں داخل ہوئیں۔ تو وہ جاگ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے انگڑائی بیچ میں توڑ دی اور گھبرا کر چادر اپنے گرد سمیٹ لی اور اپنی جھینپی ہوئی مسکراہٹ کو سگریٹ کے دھویں کے پیچھے چھپانے لگا۔

"بے بی —" اس نے ہکلا کر کہا اور وہ پتھر کا بت بن کر ٹھٹک گئیں۔

"بے بی کہاں ہے؟" اس نے سگرٹ کے سلگتے ہوئے سرے پر

نظریں جما کر پوچھا۔

"بے بی ـــــ ؟" آواز ان کے گلے میں سہم کر رہ گئی۔

" ہاں ـــــ " وہ غور سے انہیں پہچان کر بولا ـــــ " وہ آپ کی بیٹی ہے نا ، کتنی شکل ملتی ہے آپ دونوں کی !" وہ انگریزی میں بولا۔

" کیا بک رہے ہو ؟" انہوں نے عزدر سے تن کر کہا۔

" میں اتنا کمینہ نہیں ہوں میڈم ۔ ہم شادی کرلیں گے ۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تکنے لگیں ۔ پھر جلدی سے میک اَپ کا بیگ اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے بھینچے لوٹ آئیں۔

انہوں نے ایک بار پھر اپنی شکل آئینے میں دیکھی ۔ اور اس سنسان کھنڈر کے پیچھے کمسن حسینہ کو ڈھونڈھنے لگیں جسے نیم تاریک کمرے کی دھواں بھری فضا اور شراب کے نشے نے اس نوجوان کی بہکی ہوئی آنکھوں میں ایک شام کے لئے جنم دے کر سورج کی ظالم کرنوں نے چھلنی کر دیا تھا ـــــ وہ خوابوں کی شہزادی ان سے بہت قریب اس کھنڈر میں دفن ، ابدی نیند سو رہی تھی ۔ انہوں نے میک اپ کا بیگ دور کونے میں پھینک دیا اور آنسوؤں سے چھلکتے قہقہے لگانے لگیں

ناشتے پر سوچی سوچی غلافی آنکھوں والا نوجوان بڑی بے چینی سے بے بی کے قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے قرار تھا۔ بار بار وہ ان کے نقوش میں اس کھوئے ہوئے خواب کو ڈھونڈ کر پاتا اور خود

ہی جھینپنے لگتا۔

"جانے سے پہلے صرف چند منٹ کے لئے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجہ کی مٹھاس ان کے کلیجے میں رس گھول گئی۔ انہیں اس کی لجاجت پر پیار آگیا۔

"تم اس سے نہیں مل سکتے۔" انہوں نے بڑی مشکل سے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

"کیوں؟ — مگر— میں اُن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"پلیز— ناشتہ ختم کیجئے اور تشریف لے جائیے۔" انھیں غصہ آنے لگا۔ جیسے واقعی اس نے ان کی معصوم بیٹی کو خراب کر دیا ہو—!

اس نے ناشتہ نہیں کیا۔ سر پکڑے خاموش پلیٹ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

"تھوڑی سی وہسکی مل سکے گی؟" اس نے دونوں ہتھیلیوں سے کنپٹیاں دبائیں۔

"نہیں —" وہ بڑی درشتگی سے بولیں۔

جاتے وقت اس نے بڑی رقت بھری آواز میں التجا کی۔

"بے بی سے کہنا۔ میرا انتظار کرے۔ دورے سے واپس لوٹتے وقت میں پھر آؤں گا— شادی کے بعد میں اسے لدھیانہ لے جاؤں گا—"

اس نے احمقوں کی طرح آنکھیں جھپکا کر آنسو پی لئے۔

سپاہی

جب وہ چلا گیا تو وہ دیر تک افق کے پاس پار "بےبی" کو نوجوان کی مضبوط باہوں میں سوتا ہوا دیکھتی رہیں۔ بمبئی کے ہنگاموں سے دور —— اس جھڈب قحبہ خانہ اور مسز دوراب جی کے چنگل سے آزاد —— نت نئے سیاحوں کی گرفت سے باہر —— کھلے کھیتوں کی مہکتی ہوئی شبنم میں نہائی ہوئی کچی دھرتی کی گود میں —— وہ گیندوں کے متوالے جسم، گیندے اور چنبیلی کے گوندھے ہوئے دو تر و تازہ گجروں کی طرح ایک دوسرے میں الجھے ہوئے —— ان کی بے رونق آنکھوں میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی طرح کھٹکتے رہے۔ اور نیند ان کی بوڑھی آنکھوں میں زہر گھول کر نہ جانے کہاں جا سوئی تھی!

***

ریت کے ذروں کی طرح کھٹکتے رہے۔

کنواری

اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے وہ اتنی بہت سی سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ آئی تھی۔ آتے ہی وہ بے سدھ پلنگ پر گر پڑی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

میں خود خاموش رہنے کے موڈ میں تھی۔ مگر اس کی حالتِ بد دیکھ کر مجھے پریشان ہونا پڑا۔ اس کا رنگ بے حد میلا اور زرد ہو رہا تھا۔ کھلی کھلی بے نور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ منہ پر میک اپ نہ تھا۔ خاص طور پر لپ اسٹک نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیمار اور بوڑھی لگ رہی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے بتائے ہوئے ڈاکٹر کا علاج تسلی بخش ثابت ہوا۔

اس کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور سینہ سپاٹ ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس قتل کی میں بھی کچھ ذمہ دار ہوں۔ مگر میں ڈاکٹر کا پتہ نہ بتاتی تو کوئی اور بتا دیتا۔ بن بلائے مہمان کو ایک دن نکالا تو ملنا ہی تھا۔

"ایک مشورہ لینے آئی ہوں ۔" سانس قابو میں آتے ہی اُس نے کہا۔

"جمعہ جمعہ آٹھ دن بیتے نہیں اور مردار کو پھر مشوروں کی ضرورت آن پڑی ۔" میں نے سوچا، مگر نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔

"لو۔ ضرور لو ۔ آج کل بہت مشورے میرے دماغ میں بجبجا رہے ہیں"

"آپا، میں شادی کر لوں"۔ اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔ گویا اگر میں نے اجازت نہ دی تو وہ کنواری ارمان بھری مر جائے گی۔

"مگر تمہارا شوہر؟"

"موت آئے حرامی پلّے کو اُسے کیا خبر ہوگی؟"

"یہ بھی ٹھیک کہتی ہو ۔ بھلا تمہارے شوہر کو تمہاری شادی کی کیا خبر ہوگی۔" میں نے سوچا۔ "مگر تمہاری شادی کے چرچے اخباروں میں ہوں گے ۔ آخر اتنی بڑی فلم اسٹار ہو۔"

"فلم اسٹار کی دم میں ٹھینگا۔" اللہ گواہ ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ گالی ہوئی کہ نہیں ۔ مدن ایک سانس میں میں تین گالیاں بکنے کی عادی ہے ۔ مجھے تو اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ گالی جیسا سنائی دیتا

ہے - مگر یہ حقیقت ہے کہ سوائے چند عام گالیوں کے یہ گل کاریاں
میرے پلے نہیں پڑتیں۔

"بھئی ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔" میں نے بات کی
لگام ایک دم دوسری سڑک پر موڑ دی ۔" تم شادی شدہ ہو تو تمہارا بچہ
حرامی کیسے ہوا؟"

" اوہ، آپا۔ اللہ کا واسطہ، کبھی تو سمجھا کرو۔ کمبخت شادی تو شبو دو سال
کا تھا۔ تب ہوئی تھی ۔"

"شبو کے باپ ہی سے نا؟" میں نے سہم کر پوچھا

"اوہنوں، تمھیں یاد تو کچھ رہتا نہیں ۔ بتایا تو تھا— وہ کمبخت —"

" اچھا!— یاد آگیا— وہ تمھیں گرہستی کا شوق چرایا تھا۔" میں
نے اپنی کند ذہنی پر شرمندہ ہو کر کہا۔

" بھوسا چرّایا تھا۔ ماں کے خصم نے دھندا کرانا شروع کر دیا۔" پتا
نہیں ماں کا خصم رشتہ میں کیا ہوا؟

" اونہہ ۔ چھوڑو اس نامراد شادی کا تذکرہ ۔ نئی شادی کا ذکر کرو ۔
اللہ رکھے کب کر رہی ہو ۔ کون ہے وہ خوش نصیب؟"

" سندر!"

وہ قہقہہ مار کر قالین پر لوٹ گئی۔

ایک ہی سانس میں اس نے سب کچھ بتا ڈالا ۔ کب عشق ہوا ۔
کیسے ہوا۔ اب کن مدارج سے گزر رہا ہے ۔ سندر اس کا کس بُری طرح

دیوانہ ہو چکا ہے۔ کسی فلم میں کسی دوسرے ہیرو کے ساتھ لو سین (LOVE SENE) نہیں کرنے دیتا اور وہ خود بھی اُسے کسی دوسری ہیروئن کے ساتھ رنگ رلیاں نہیں منانے دیتی۔

"آپا، یہ فلم والیاں بڑی چھنال ہوتی ہیں۔ ہر ایک سے لنگر لڑانے لگتی ہیں۔" اس نے ایسے بھولپن سے کہا جیسے وہ خود بڑی پارسا ہے۔ "آپا، کوئی چٹ پٹی سی کہانی لکھو۔ ہم دونوں اس میں مفت کام کریں گے۔ مزا آجائے گا۔" اس نے چٹخارا لیا۔

"سنسر سب کاٹ دے گا۔"

"سنسر کی ...." اس نے موٹی سی گالی سنسر کی قینچی پر داغی

"شادی کے بعد کام تھوڑی کروں گی۔ سندر کہتا ہے اپنی دلہن کو کام نہیں کراؤں گا۔ چمبور میں بنگلہ لے لیں گے۔" خوابوں کے جھولے میں پینگ لیتے ہوئے کہا اور ایک دفعہ تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اِس کی دنیا بس جائے گی۔ چمبور بنگلے میں وہ بیگم بنی بیٹھی ہوگی بچے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوں گے۔

"اماں کھانا۔ اماں کھانا۔" وہ چلّائیں گے

"اے ہے ذرا صبر کرو ـــ آلو تو گل جانے دو۔" وہ کفگیر سے انہیں مارے گی۔

تب بچوں کا باپ مسکرائے گا۔ "بیگم کیوں مارتی ہو۔ ابھی بچے ہیں۔"

"بس ایک لونڈا ہو جائے پھر سالے کو شادی کرنی پڑے گی۔"

"تو کیا ابھی شادی نہیں ہوئی؟" خوابوں کی بستی سے لوٹ کر میں نے پوچھا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ جیسے میری اپنی کنواری کی بارات ڈوائنے سے لوٹ گئی ہو۔

"نہیں آپا۔ حرامزادہ ہے بڑا چالاک۔ نہ جانے کیا کرتا ہے۔" وہ دیر تک سندر کو پھانسنے کی ترکیبیں پوچھتی رہی۔ نہ جانے کیوں یہ بات اُس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اگر بچہ ہو گیا تو سندر کے پیر میں بیڑیاں پڑ جائیں گی۔

"اور پھر بھی اس نے شادی نہ کی تو؟"

"کرے گا کیسے نہیں اس کا تو باپ بھی کریگا۔"

"خیر، باپ کا ذکر فضول ہے وہ مر بھی چکا۔"

"حرامزادے کی چھاتی پر چڑھ کر خون نہ پی جاؤں گی۔"

"شبھو کے باپ کی چھاتی پر چڑھ کر کے کیوں نہ خون پی گئیں۔"

"جب میری عمر ہی کیا تھی۔ الٹی چور سی بن کے بیٹھ گئی۔ بس تم کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ سالے کی ایک نہ چلے اور..... جو ترکیبیں وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی ان سے مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔

مدن کئی بار سندر کو لے کر میرے ہاں آئی۔ سندر اپنے نام کی طرح حسین اور نو عمر تھا۔ مدن سے کسی طرح بڑا نہ معلوم ہوتا تھا۔ نیا

نیا کالج سے آیا تو بھو کے بنگالی کی طرح چومکھے عشق لڑانے شروع کر دیئے اسی چھین جھپٹ میں مدن اسے اڑا لائی۔ اچھے گھرانے کا قہقہہ باز اور باتونی لڑکا پہلی ہی دفعہ گھر میں ایسا بے تکلف ہو گیا۔ جیسے برسوں سے آتا جاتا ہے۔

اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ کیوں مدن اسے دل دے بیٹھی اس کی صحبت میں ایک لمحہ بھی اداس نہیں گزرتا تھا۔ مدن جیسی پٹی پٹائی غم نصیب لڑکی کے لئے ذرا سی نرمی بھی چھلکا دینے کو کافی تھی۔ وہ سندر کے ہر جملے پر بے تحاشا قہقہے لگاتی۔ وہ بات پر نہیں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر لبوں کی جنبش پر مسحور ہو کر کھلکھلا پڑتی۔ مسرت کی اچھلتی کودتی موجیں اسے جھکول ڈالتیں۔ سندر کے لب ہلتے اور وہ قہقہہ مارتی — پانی پیتی ہوتی تو اچھو لگ جاتا۔ کھانا کھاتی ہوتی تو منہ کا نوالہ سامنے بیٹھنے والے کے اوپر چھڑک دیتی۔

وہ دونوں نہ جانے اپنا گھر چھوڑ کر میرے ہی ہاں کلیلیں کرنے کیوں آتے تھے۔ بچوں جیسی شرارتیں کرتے، قلابازیاں کرتے۔ کبھی روٹھتے کبھی منتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بکری کے وہ کھلنڈرے بچے یاد آجاتے جو پر لئے کھیت میں پھدکنے آجاتے ہیں۔ کیا دندناتا ہوا عشق تھا دونوں کا! بے پروں کے ہوا میں اڑے جاتے تھے۔

جنگلی ہرنیوں جیسے چوکڑیاں بھرتے ہوئے پیار نے مدن کی کایا پلٹ کر دی۔ وہ ایک دم بے حد حسین اور جاذب نظر بن گئی۔ جلد کے نیچے

دیئے روشن ہو گئے۔ سوئی ہوئی آنکھیں جاگ اٹھیں۔ ہزاروں جادو سرگوشیاں کرنے لگے۔ سپاٹ سینہ کھل اٹھا۔ کولہے لہرانے لگے۔ سندر سے کشتیاں لڑ لڑ کر وہ پھرتیلی بن گئی۔

سندر کی اور مدن کی جوڑی بن گئی۔ جن فلموں میں وہ سندر کے ساتھ نہ تھی۔ انہیں ڈفرانا شروع کر دیا۔ سیٹ سے بڑے معرکے کے سین میک اپ روم میں ہونے لگے۔ وہ فلمیں جو آدھی ہو گئی تھیں۔ چیتھڑا ہو گئیں۔ مدن نے پہلی بار کسی نوجوان کو دل دیا تھا۔ سب کچھ بھول کر وہ اسی میں ڈوب گئی۔

سندر اس کے بڑے لاڈ سہتا۔ اس کے چھچھورپن پر ہنستا۔ اس کے اجڑے ہوئے گھر میں جا کر جان ڈال دیتا۔ نانی کو اماں اماں کہہ کر مسکا لگاتا۔ خالہ سے بیٹھ کر غپیں مارتا۔ بھائی کو وہسکی پلاتا۔ بچوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچاتا۔ اسے مدن کے جسم سے مطلب تھا۔ اس کی آمدنی اسی طرح منہ بولے رشتہ داروں کے تنور میں جھونکی جاتی تھی۔ شبو کو وہ بہت پیار کرتا ——

مدن نے اس بدنصیب بچہ کا حال اسے سنا دیا تھا۔ وہ اسے بیٹا کہہ کر گود میں بٹھا کر گھنٹوں پیار کی باتیں کیا کرتا۔

"آپا، شبو نگوڑے کو بیٹا کہتا ہے۔ بس تم ہی سمجھ لو کیا بات ہے؟" وہ جھوم کر کہتی اور میرے کانوں میں مدن کی بارات کے ڈھول گونجنے لگتے۔ دیکھنے میں سندر کیسا اوبالی سا تھا۔ مگر بچوں کے معاملہ میں اس کا رویہ حیرت انگیز تھا۔ آتے ہی بچے اسے مکھیوں کی طرح گھیر لیتے اس کی جیبیں کیا تھیں عمر عیار کی

زنبیل تھیں، رنگین پنسل، پٹاخوں کی ڈبیاں، کاغذ پر اتارنے کی تصویریں چاکلیٹ میٹھی گولیاں، نہ جانے کیا الا بلا نکال کر بانٹنے لگتا۔ ایک دن بچی نے میری سینٹ کی شیشی توڑ دی۔ میں نے اسے مارنا چاہا تو میرے ہاتھوں سے اسے جھپٹ کر لے گیا۔

" آپ ماریں گی تو اسے اپنے گھر لے جاؤں گا" وہ اسے کندھے پر بٹھا کر بولا

" اس نے میری شیشی توڑی ہے۔ ضرور ماروں گی۔"

ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے مارنے والوں کے۔ یہ لیجیے اپنی شیشی۔" اس نے جیب سے نئی منہ بند شیشی نکال دی۔" مگر انہیں پوری شیشی نہیں دیں گے آدھی تھی بس آدھی ملے گی۔" اس نے شیشی کھول کر خوب بچوں کے لبادے کپڑوں اور میلی ہتھیلیوں پر چھڑکی۔ آدھی رہ گئی تو میرے سامنے ڈال دی۔ جب وہ بچوں کو بٹور کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تو مدن نے رو کر میرے شانے پر سر ڈال دیا۔

" آپا، ایسے اوٹ پٹانگ آدمی کے ساتھ کوئی پیار کیسے نہ کرے؟"

اور پھر مدن کی زندگی نے ایک نیا جھٹکا کھایا۔ سندر کے گھر سے تار آیا کہ ماں سخت بیمار ہے۔ فوراً آجاؤ۔ مدن ساتھ جانے کے لئے مچل گئی۔ اس نے اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کر ڈالے۔ شام سے ہی اس کے لئے وہسکی کی بوتل لے کر پہنچی۔ اُسے دست کر دیا۔ بڑے نازک لمحوں میں ساتھ لے جانے کی قسمیں دیں۔ مگر سندر ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی۔ نہ سوئی، نہ سونے دیا۔ مگر صبح ہوتے ہی پرندہ ساری تیلیاں

جھٹک کر اڑ گئی۔

ایروڈرم سے سیدھی میرے اوپر نازل ہوئیں۔ مجھے اس قسم کے مریل عاشقوں سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ مگر اسے یوں تباہ حال دیکھ کر میرا جی پسیج گیا۔ جیسے برسوں کی بیمار۔ ایک ہی رات میں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ منہ پر پھٹکار۔ یہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں دیر تک سوچتی رہی۔

میں کیوں اس کم بخت کے بارے میں سوچوں۔ دنیا میں کتنے بڑے بڑے مسئلے ہیں۔ جن میں جی الجھا ہوا ہے۔ پھر آخر میں اس کا خیال کیوں کرتی ہوں۔ میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہی ہوں۔ مدن اس لائق نہیں مجھے اپنا جی ہلکا کرنے کے لئے ہی سہی اس بوجھ کو بانٹنا ہوگا۔

کتنے دن سے جب قلم اٹھاتی ہوں، مدن کا خیال مجھ سے اکڑ کر کہتا ہے "میں زندہ ہوں۔ میرے سینے میں دل دھڑک رہا ہے۔ میری رگوں میں خون دوڑ رہا ہے ــــ رلائے دو ــــ مجھے بتاؤ، میں کیوں ہوں۔ اور کب تک رہوں گی؟" اچھا ہے۔ میرا قلم ایک بار مدن کو اگل دے۔ پھر منتیاں آپ ہی بند ہو جائیں گی۔

"آپا، ایک تار لکھو" اس نے تھوڑی دیر سوکھی سوکھی آہیں بھر کر کہا۔

"کیسا تار؟"

"کم سون ڈائینگ۔ یعنی جلدی آؤ۔ مر رہی ہوں"

"مگر ابھی تو وہ پہنچا بھی نہ ہوگا" میں نے ٹالنا چاہا۔ پھر جان کو آ گئی تو لکھ دیا ڈائینگ نہ لکھا۔

شام کو ہانپتی کانپتی آئی، بڑی شرمائی ہوئی تکئے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی

میں نے کہا۔ "خیریت ؟"

" تار لکھ دو !"

" صبح تو لکھا تھا۔

" صبح مجھ نصیبوں جلی کو کہاں معلوم تھا ؟" وہ پھر شرمائیں " ابکائیاں آ رہی ہیں آپا لیموں منگوا دو۔"

" او ہو ۔۔۔ یہ بات ہے ! مبارک ہو۔" میرے سر سے بوجھ سا اتر گیا! یہ بس چٹکی کامیاب رہی۔ " ڈاکٹر کے پاس گئیں ؟"

" وہیں سے تو آ رہی ہوں۔ ڈاکٹر حرامی پلا کیا جانے۔ کہتا ہے دو دن چڑھ جانے سے کچھ نہیں ہوتا ۔۔۔ کچھ نہیں ہونا کا بچہ ! ۔۔۔ آپا! کپڑے وغیرہ تو سلوا دو گی ۔۔۔ ہنک، ہنک۔ بھئی ہم سے تو نہیں پلے گا۔ تم پال دو گی۔ میں نے حامی بھر لی۔

" تو پھر تار لکھو نا ؟"

" کیا لکھوں ؟"

" لکھو ۔۔۔ سن بورن۔ کم سون۔"

" گدھی ہو تم، ابھی کہاں سے سن بورن ؟"

" اچھا تو سن بورن ہونے والا لکھ دو۔"

" چلو سڑن۔ اس کے آنے کا انتظار کرو، اور کیا معلوم شاید لڑکی ہو۔"

" واہ، لڑکی چھتال کاہے کو ہوگی۔ میری طرح سڑنے کو۔ میرا جی کہتا ہے

لڑکا ہی ہوگا۔" پھر تھوڑی دیر سوچ کر ایک دم بولیں۔

"مرجائے اللہ کرے۔"

"کون؟" میں نے چونک کر پوچھا

"سمندر کی ماں، الو کی پٹھی - بیمار ویمار کچھ نہیں - سسری نے اپنے یار کو بلانے کے لئے ڈھونگ رچایا ہے۔" اس نے نہایت پُر مغز قسم کی پھولدار گالیاں ٹکائیں۔

"احمق ہو تم، کیسے معلوم؟"

"ارے میں خوب جانتی ہوں ان میسنت بیٹیوں کو۔" جب سے مدن کی زندگی میں سمندر آیا تھا اس نے گالیاں بکنا بند کر دی تھیں۔ سُمندر کے پیار نے رستے زخموں پر پھاہے رکھ کر غلاظت کا منہ بند کر دیا تھا۔ اس کی آنکھ اوجھل ہوتے ہی پچھلے زخموں کے منہ کھل گئے - پیپ بہنے لگی - اس کے مُنہ سے پھر وہی گالیاں سنکر میرا جی بیٹھ گیا - مارے غصے کے مدن پٹاخوں کی لڑی بن گئی۔

"اسس کا تعلق ہے۔"

"کس کا؟"

"اس کی اماں بھیا کا - سچی آپا، بہت سی عورتیں ایسی ہوتی ہیں - بچپن ہی ......"

"لعنت ہے تمہاری زبان پر"

"اللہ قسم آپا —— ہمارے پڑوس میں ایک بیوی رہتی تھیں اپنے سگے

بھائی سے ....."

"میں نے اُسے روک دیا۔ "للہ تفصیلوں میں نہ جاؤ۔ میرا قلم بیٹ کا بڑا ہلکا ہے۔ کل کلاں کو منہ سے بات نکال بیٹھا تو لوگ مجھے اُلّو بنا دیں گے۔"

دوسرے دن ماتم کناں پھر لوٹ پڑیں۔ کل جیسے ڈاکٹر کا کہنا ہی ٹھیک نکلا۔ دن چڑھ گئے تھے، سو اتر گئے۔ ساتھ ساتھ مدن کی کمان بھی اُتر گئی ایسی بلک بلک کر روئیں جیسے جوان بیٹا جاتا رہا ہو۔ یہ عورت ہے یا لطیفہ۔ کل جس بلا کے خوف سے بوکھلائی پھر رہی تھی۔ آج اس بلا کی آرزو میں جان دیئے دیتی ہیں۔ لگیں مجھ سے ترکیبیں پوچھنے۔ بھلا میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے جو چوہے کو گھوڑا بنا دوں۔ ڈاکٹر نے کچھ اشارہ تو کیا تھا کہ آئندہ ایسی مصیبت سے پالا نہیں پڑے گا میں اسے باوجود کوشش کے نہ بتا سکی۔ کہ سندر کو پھانسنے والی چال کے پیر مفلوج ہو چکے ہیں۔

صبح شام مدن نے تاروں کی ڈاک بٹھا دی۔ کام پر اس نے لات مار دی۔ ایک پروڈیوسر نے کورٹ میں لے جانے کی دھمکی دی تو وہ ناک بھر ڈھیر سا مرہم تھوپ کر پڑ گئی۔ میں بھی مرہم کی مقدار دیکھ کر دہل گئی — گئی ناک، میں نے سوچا۔ مگر جب پروڈیوسر چلا گیا تو مزے سے ناک پونچھ کر ہنسنے لگی۔

"مگر مجھے بے وقوف کیوں بنایا تم نے؟" میں نے چڑ کر کہا اور چلی آئی۔

اخباروں میں اسقاط کی خبریں چھپنے لگیں۔ مدن نے ذرا شرما کر تصدیق کر دی۔

میں نے پوچھا۔ کیوں۔ "یہ کیوں؟"

"سور کو پتہ چلے گا تو بہت کڑھے گا۔ میں کہہ دوں گی، میں سمجھی تم چھوڑ کر چلے گئے۔ بدنامی کے ڈر سے گولیاں کھالیں۔ مرد بچہ ہے کچھ تو دل کو ٹھیس لگے گی۔"

ایک دن جوالی بانتمہ روتی ہوئی آئی۔

"تم نے مجھے نہیں جانے دیا۔ یہ دیکھو" وہ اخبار جس میں سندر کی منگنی کی خبر تھی، دکھا کر لڑنے لگی۔

"چہ خوش۔ میں نے کب منع کیا" میں نے جل کر کہا "جاؤ میری بلا سے جہنم میں۔"

اور وہ شام کے ہوائی جہاز سے جہنم کی طرف اڑ گئیں۔

گیارہ بجے رات کو جب وہ سندر کے گھر پہنچیں تو گھر میں سوائے بوڑھے دادا اور نوتے کے کوئی نہ تھا۔ سب کے سب سندر کی کوئی فلم دیکھنے گئے تھے۔ سندر کے دادا فلم لائن کے ویسے ہی خلاف تھے انہیں معلوم تھا کہ ان فلم والوں کے چال چلن کچھ یوں ہی ورق سے ہوتے ہیں۔ پھونک ماری اور غائب۔ آنکھیں پھاڑ کر وہ مدن کو گھورنے لگے مدن بمبئی سے گرم کپڑے بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ بھوک الگ لگ رہی تھی۔

بارہ بجے کے بعد سندر بہن بھائیوں کی ٹولی میں ہنستا قہقہے لگاتا آیا

تو مدن رو پڑی - کیا وہ بھی کبھی یوں خاندان میں گھل مل کر ان کی اپنی بن سکے گی - اس کے دیور جیٹھ ہوں گے - نندیں اور دیورانیاں ہوں گی -

"بہو - لڑکا رو رہا ہے - بھوکا ہے" ساس کہے گی - اس نے پکا ارادہ کر لیا - وہ اپنی ساس سے کبھی نہیں لڑے گی - نندوں کی خوب خاطر کرے گی - دادا کا حقہ بھرے گی - اور توتے کو بھیگے چنے کھلائے گی - سندر کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر اس کے چوڑے چکلے سینے سے لپٹ جائے اور اسے مٹھیوں سے کوٹ ڈالے اس کے بھورے گھنے بالوں میں انگلیاں ڈال کر نوچ ڈالے - مگر ساس نندوں کی شرم نے اس کے پیر تھام لئے -

اسے دیکھ کر سندر کے حلق میں قہقہہ لوہے کا گولا بن کے اٹک گیا - ماں بہنوں کے سامنے اپنی داشتہ کے وجود سے شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا - مصنوعی خوش مزاجی سے بولا -

"ارے آپ"

"آپ کے بچے!" مدن نے دانت پیسے مگر سندر کی گھبراہٹ پہ ترس کھا گئی -

"جوہری سے کچھ زیور بنوانے تھے - چاندنی کندن کا کام دلّی جیسا بمبئی میں نہیں ہوتا - سوچا - دلی کی سیر بھی ہو جائے گی اور زیور بھی دیکھ لوں گی"

سندر مدن کی اعلیٰ ایکٹنگ کا قائل تھا - آج تو لوہا مان گیا -

جب اس کو سندر کی بہنوں کے کمرے میں سلایا گیا - تو وہ بہ مشکل کالیوں کی زنجیر کو نگل سکی جو اس کے حلق میں الجھنے لگی - خیر جب سب سو جائیں گے

تو سندر اُس کے پاس آئے گا۔ سب سو گئے اور وہ سندر کے پیروں کی چاپ کے انتظار میں پڑی رہی۔ اس کا جسم سندر میں جذب ہونے کے لئے ترس رہا تھا۔ راستے بھر کیسے کیسے خوابوں کے جال بنتی آئی تھی۔ سندر سو رہا ہوگا۔ وہ چپکے سے پہلو میں رینگ جائے گی۔ اُسے محسوس کر کے سندر جھوم اُٹھے گا۔ پہلے وہ خوب ترسائے گی، خوب روٹھے گی۔ پھر دونوں من جائیں گے۔ ساری کسک، ساری دوری مٹ جائے گی سارے راستے وہ اسی حادثہ کو دل میں دہرا کر چٹخارے لیتی آئی تھی۔ اسی لئے تو وہ اپنی جھاگ سی ناٹی لینی آئی تھی جو ہاتھ کے لمس سے دھوئیں کی طرح پگھل کر غائب ہو جاتی تھی۔

مدن سندر کے پیروں کی چاپ سننے کے لئے بے قرار ہمہ تن گوش بن گئی۔ دبے پیروں سے وہ پلنگ سے اٹھا ہوگا، اس نے منتظر نامہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ اس کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہوگا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ — اس نے اندازے سے وہ سارے قدم گن ڈالے جو اس کے اور سندر کے درمیان حائل تھے۔ گنتے گنتے وہ تھک گئی اگر وہ ہزار میل پر ہوتا تو بھی اب تک پہنچ چکا ہوتا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ احساس کے تناؤ سے کنپٹیاں بھیگے چمڑے کی طرح کسنے لگیں۔ شاید سندر کے بھائی جاگ رہے ہوں گے اور وہ ان کی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔

سندر کی گلگو تھا سی بھولی بھالی بہنیں کیا میٹھی نیند سو رہی تھیں۔ ان کے خواب کتنے سہانے تھے۔ ان کے دلوں میں کسی بے وفا کے پیار

کے زخم نہیں پڑے تھے۔ اُسے غصہ آنے لگا۔ اے کاش، کوئی ان کا جہاں بھی لوٹ مارے ان کے بلٹوں میں سانپ چھوڑ دے گی کہ یہ بھی گھور اندھیارے میں کسی کے پیروں کے نشان ٹٹولتے پھریں۔ پھر سندر کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔

آخر کس جرم کی سزا میں اس کا بچپن اتنا ویران اور جوانی زخم زخم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سے زیادہ ضبط ہو سکا۔ اور وہ سندر کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ جہاں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ سو رہا تھا۔

وہ جیسے ہی باہر نکلی۔ نوتا اجنبی صورت دیکھ کر آنکھوں کے لٹو گھمانے لگا

"کون؟" دادا نے ہانک لگائی۔ وہ چوروں کی طرح کھمبے کے پیچھے دبک گئی۔

دادا اٹھے اور چبوترے پر کھڑے آدھ گھنٹے تک رفع حاجت کرتے رہے۔ "مر گیا بڈھا شاید کہ ہلتا ہی نہیں۔" وہ سائے سائے پھر چلی۔ ایک پیڑھی سے پیر الجھا۔ اور دھڑام سے گری۔ گھر میں جگار ہو گئی اور وہ پھر اپنے پلنگ پر جا کر دبک گئی۔

صبح موقع پاتے ہی اس نے سندر سے کہا: "سیدھی طرح بمبئی چلو بیٹا۔ ورنہ خون خرابے ہو جائیں گے۔"

"تم نے تار تو دیا ہوتا۔ کسی ہوٹل میں انتظام کرا دیتا۔"

"کیوں۔ کیا جاگیر میں لوٹا آیا جا رہا ہے؟ مرے کیوں جاتے ہو کھانے کے پیسے لے لینا۔"

" داموں کی بات نہیں مری جان! میرے گھر والے بڑے نیرو مائنڈڈ ہیں۔ فلم والوں کو پسند نہیں کرتے "

" تم بھی تو فلم والے ہو "

" میری اور بات ہے۔ تم شام کی گاڑی سے چلو پرسوں میرے بہنوئی آرہے ہیں اُن سے مل کر..... "

" تو میں بھی نہیں جاؤں گی " بڑی جھک جھک کے بعد یہ طے ہوا۔ مدن بظاہر بمبئی کے لئے روانہ ہو جائے۔ ایک اسٹیشن بعد نئی دہلی اُتر کر کسی ہوٹل میں ٹھہر جائے۔ سندر وہیں آجائے گا۔ بڑی دھوم دھام سے سارا گھر مدن کو اسٹیشن پہنچانے گیا۔ وہ ایک دم فلم سٹار بن گئی۔ چھوٹے بھائیوں نے تو ہار بھی پہنائے۔

نئی دہلی اُتر کر وہ ہوٹل میں ٹھہر گئی۔

دو پیاسے انسان ایک دوسرے میں غرق ہو گئے۔ مدن کے سارے دکھ دور ہو گئے۔ وہ انتظار کی گھڑیاں۔ وہ لا متناہی فاصلہ سب سندر کے پیار نے پاٹ دیا۔ مگر باوجود خوشامد کے سندر رات گزارنے پر راضی نہ ہوا ——" میری ماں میرے بغیر رات بھر بنا کھائے بیٹھی رہے گی "

" تمہاری اماں کی ——" وہ موٹی سی گالی چبا گئی۔ سندر کی جان کو آگئی، اس کے کپڑے چھپا دئے اس کے جوتے گود میں دبا کر بیٹھ گئی دس مرتبہ دروازے سے بار بار خدا حافظ کہنے کو بلایا۔ مگر جانے والے کو نہ روک سکی۔ وہ اسے سُونے اجنبی بستر پر سسکیاں بھرتا چھوڑ کر

چلا گیا۔

دوسرے دن سندر حسب وعدہ آ گیا۔ مدن نے پورا بکس بیئر کی بوتلوں کا برف میں لگا کے رکھا تھا۔ آتش دان میں دھیمی دھیمی آنچ اٹھ رہی تھی۔ مدن کی نائیٹی پگھل رہی تھی۔ سندر بیئر پیتا رہا۔ اور وہ اس کی آغوش میں بکھرتی رہی۔ کاش کوئی وقت کی لگام میں پکڑ کے روک دیتا۔ یہ لمحے یوں ہی فضا میں معلّق ہو جاتے وہ اسی طرح سندر میں تحلیل ہو جاتی۔ دوئی کا سوال مٹ جاتا۔ وہ پیتے رہے۔ سوتے رہے۔ پھر جاگ اٹھے اور پھر سو گئے۔

شام کو دونوں ننھے بچوں کی طرح ٹب میں چہلیں کرتے رہے۔ باہر کی دنیا ان کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ گیلے بدن آتش دان کے پاس دوزانو ہو کر انہوں نے اپنی دنیا پالی تھی۔

دن بھر کی بیئر کا نشہ پھیکا پڑنے سے پہلے وہسکی کا رنگ چڑھنے لگا۔ مدن کسی نہ کسی بہانے سے سندر کو لگاتے رکھنا چاہتی تھی اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس کی ممی بنا کر تکیہ پر سلا دیتی۔ اور پھر اس کے مُنہ پر منہ رکھ کر ابدی نیند سو جاتی۔ بس نہ تھا جو اسے ساری دنیا سے چھین کر اپنے دل کے کسی کونے میں قید کر دے اور ایسا زبردست تالا ڈالے کہ سر پٹکے نہ کھلے۔

مگر بیئر نہ وہسکی! سندر کے جاتے قدم ڈگمگا نہ سکے۔ مدن پر بھوت سوار ہو گیا۔ سندر نے حسب معمول اس کی ٹھکائی شروع کی۔ اتنی زور سے اس کی

پسلی میں لات ماری کہ آنکھیں نکل پڑیں۔ گھبرا کر اس نے پھر سے اسے باہنوں میں سمیٹ لیا۔ بس یہی ادا تو مدن کے من کو بھا گئی تھی۔ اسے یوں بکھیرنے اور سمیٹنے ہی میں لطف آنے لگا تھا۔ اس چار چوٹ کی مار ہی میں لذت ملنے لگی تھی مدن تو چاہتی ہی تھی کہ وہ اسے اتنا مارے، اتنا مارے کہ ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں۔ تب وہ اسے چھوڑ کر نہ جا سکے گا۔

مگر خاندان والوں کی دہشت، مدن کے پیار سے زیادہ مہیب ثابت ہوئی اور وہ چلا گیا اور مدن صبح تک آہیں بھرتی رہی، تڑپتی رہی۔

کاش وہ لنگڑا، لولا اور اپاہج ہوتا، اس کے سب جاننے والے اسے بھول جاتے اور وہ صرف اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ بمبئی میں سندر کو ایک مرتبہ بخار آیا تھا۔ دنیا کو لات مار کر وہ اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ رہی نہ اس کے گھر کی خبر کی نہ ملنے جلنے والوں کو آنے دیا۔ بیٹھی مسلسل اس کے جلتے ہوئے ہونٹ چومتی رہی۔ پھر بھی چین نہ پڑا تو بخار میں جھلستے ہوئے جسم سے لگ کر سو رہی۔ خواب میں اس نے دیکھا۔ گرم گرم سنہری آنچ میں وہ پگھلتی رہی ہے اور وہ سندر کے جسم پر خول بن کر منڈھ گئی ہے اس کے رشتہ دار کسی جتن سے بھی مدن کا پلستر نہ کھرچ سکیں گے۔ ڈاکٹر نے اسے ڈرایا کہ اگر وہ گھنٹے میں ہزار بار اسے ٹٹولے گی تو وہ اچھا نہ ہو سکے گا۔

خدا خدا کر کے رات بیتی اور دن ہوا۔ سندر کہہ گیا تھا کہ شاید وہ دیر سے آئے۔ لمحے پہاڑ ہو گئے۔ دیوانی بلی کی طرح وہ ہوٹل میں چکر کاٹتی رہی پھر تانگہ لے کر شہر کی خاک چھان ڈالی۔ دو جوڑے لائی تھی جو جیکٹ ہو گئے تھے

اس کی اجاڑ صورت پر کسی کو فلم سٹار ہونے کا گمان بھی نہ تھا۔ ایک سینما ہال پر بھٹھ ڈلگے ہوئے تھے۔ وہاں مدن کی ہٹ فلم چل رہی تھی۔ اس کا جی چاہا تانگے پر کھڑی ہو کر ڈوپٹہ ہوا میں لہرا کر وہی گیت گانے لگے جسے لوگ سننے کے لئے دس دس مرتبہ جاتے تھے۔ مگر اس نے ٹال دیا۔ گانے کی آواز تو لٹا کی تھی۔ اس کی اپنی آواز تو رات بھر کی جگار سے پھٹا بانس ہو رہی تھی۔

کروڑوں کے دل کی ملکہ، خوابوں کی رانی کے بھرے شہر میں سنسان دل لئے تنہا وحشیوں کی طرح جب چکر کاٹتے کاٹتے پیر شل ہو گئے تو وہ کوئے جاناں کی طرف چل دی۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا۔ سارا خاندان امرتسر گیا ہوا ہے منگنی کی خبر سچ ہی نکلی۔

سر جھاڑ جھنکار، وہ سیدھی اسٹیشن سے میرے یہاں چڑھ دوڑی۔ نہ جانے کے دن سے نہ نہائی، نہ دانت مانجھے۔ اتنی بدصورت فلمی حور میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں نے مدن سے کہا " نہا ڈالو۔ کچھ کھالو"

"اب تو اس ستدر حرامزادے کی بھتی ہی کھاؤں گی۔ بیتاؤ آؤ، کیا کروں اس کمینے نے مجھے خراب کیا اور اب بیاہ رچا رہا ہے"

"اب ہو مت۔ تم پہلے ہی خراب تھیں۔" میں نے جل کر کہہ دیا۔

"آپا، تم بھی اب کہہ رہی ہو۔ تم تو بڑی روشن خیال ہو۔"

جی چاہا اسی کے لہجے میں کہہ دوں۔

"روشن خیال کی دم! بھلا اس سے زیادہ روشن خیالی اور کیا کر سکتی ہوں کہ تمھاری اس نامراد زندگی کا الزام تمہاری محرومیوں اور امرت تنہائی کے سر

تھوپ دوں۔ کیا میں تمہاری بیتی ہوئی زندگی کے قدم پلیٹ کر نئی راہ پر ڈال سکتی ہوں ؟ کیا یہ زبردستی حلق میں اتارا ہوا زہر جو تمہاری رگوں میں جذب ہو گیا ہے نچوڑ کر نتھار سکتی ہوں کہ تم الگ اور زہر الگ ؟ نہیں ۔ یہ زہر تو اب گرفت سے باہر ہو چکا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں آپا"۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور میں نے سوچا۔ بے شک میں نہیں جان سکتی ۔ تم جانتی ہو کہ وہ زندگی انسان کو کیا بنا دیتی ہے ۔ جہاں نہ ماں کا پیار نہ باپ کی شفقت نہ بھائیوں کے پیار بھرے گھونسے ۔ نہ بہنوں کی میٹھی میٹھی چٹکیاں تم شوہر کا پودا ہو نہ پھول نہ پھل۔

سندر سے ملنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی ۔جن فلموں میں وہ کام کر رہے ہیں ۔ وہ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں بننے لگیں۔

ایک دن نہ جانے کیسے سندر کے فلیٹ میں گھس گئی وہ پچھلے دروازے سے نکل بھاگا ۔ مارے غصے کے مدن دیوانی ہو گئی ۔ اس نے پھاٹک پر اسے گریبان سے جا پکڑا !

" خون کر دوں گی حرامزادے "! وہ غرائی ۔ وہ بھیگی بلی بنا اس کے ساتھ کمرے میں چلا آیا۔

"کیا چاہتی ہو"۔ اس نے بجائے مارنے پیٹنے کے نرمی سے کہا ۔ کاش وہ مارتا پیٹتا تو یہ عزیزیت کی دیوار ٹوٹ جاتی ! وہ اسے مار کر سمیٹ تو لیتا ۔ مگر نہیں وہ مارنا بھی اپنی ہتک سمجھ رہا تھا۔

" مجھے نوکر سمجھ کر رکھ لو ۔ تمہاری ماں کے پیر دھو کر پیوں گی سندر !" نہیں

پلنگ پر بٹھا کر راج کراؤں گی۔ تمہارے نوکر کتنا پیسہ چراتے ہیں۔ میں تمہاری نوکر بن کر رہوں گی۔"

"مگر ___" وہ ہکسایا "سچی بات تو یہ ہے بھئی، میں شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" مگر مدن سمجھ گئی کہ اونچے گھرانے کا پوت ایک بیسوا سے بدتر عورت کو کیسے بیاہ سکتا ہے! وہ خود ہزار عورتوں کے ساتھ رہ کر بھی کنوارا ہے اس کنواری سے بھی زیادہ پاک اور مقدس جس کا کنوارا پن کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو۔

مرد سدا کنوارا ہی رہتا ہے! سونے کے کٹورے کی طرح جس میں کوڑھی بھی پانی پی لے تو گندا نہیں ہوتا اور مدن کچا سکورا تھی جو سائے سے بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔

مدن کا خون کھول سا گیا۔ سارے زخم تازہ ہو کر کھل گئے۔ پہلے تو اس نے نہایت پھول دار قسم کی مغلظات سندر کے جنم جنم کو سنائیں پھر سارے گھر کی چیزیں توڑ ڈالیں۔ تیل کی بوتل سے آئینے کے پرخچے اڑا دیئے۔ الماری سے گلاس اور برتن نکال کر چھناچھن بجا دیئے۔ نئے سوٹ نکال کر بلیڈ سے دھجیاں اڑا دیں۔ سوئٹر، مفلر، موزے، بنیائن دانتوں سے کھسوٹ ڈالے۔ سارے شیشے ٹینس کے ریکٹ سے پھوڑ ڈالے۔ نئے قیمتی جوتوں کی قطار کی چاقو سے بوٹیاں اڑا دیں۔ دیواروں سے فریم اتار کر جوتوں سے کوٹے۔ پھر سندر کی میلی قمیض میں منہ ڈال کر رونے لگی۔

سندر خاموش سب کچھ دیکھتا رہا۔ جب مدن نے منہ سے میلی قمیص ہٹائی تو وہ خاموشی سے جا چکا تھا۔

مدن نے پھر میرے گھر پر چڑھائی کی۔ گھنٹوں مجھ سے سندر کو قتل کرنے کی ترکیبیں پوچھتی رہی وہ اسے جھٹ سے نہیں مارنا چاہتی تھی۔ رنجھا کر مارنا چاہتی تھی۔ کہ ساری عمر سسکے اسی طرح۔

"نامرد کر دوں سوئر کے بچے کو۔"

"مجھے ایسی کوئی ترکیب نہیں معلوم"۔ میں نے چڑ کر کہا۔

"اس کی آنکھوں میں تیزاب ڈال دوں ۔ ساری عمر کو اندھا ہو جائے۔"

مگر نہ سندر نامراد ہوا نہ اندھا۔ مہینے بھر کے اندر وہ کومل سی بہو بیاہ لایا۔ اچھوتی، کنواری جسے فرشتوں نے بھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ مہینوں دولھن دولہا کی فلم انڈسٹری میں دعوتیں ہوتی رہیں۔

اگر صدمے سے مدن خودکشی کر لیتی یا گھل گھل کر مرجاتی تو میری کہانی کا کتنے سلیقے سے خاتمہ ہوتا اور پھر میں لکھتے وقت ذلت محسوس نہ کرتی۔ مگر وہ پھندے میں سیسہ لگے ہوئے کھلونے کی طرح لوٹ پوٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسی ہی ایک دعوت میں وہ ایک پستہ قد نٹے لڑکے کے ساتھ وہی اپنے ازلی کھردرے ہا ہا قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ لطیفے چھوڑ رہا تھا۔ مدن کو اچھو لگ رہے تھے اور منہ کے نوالے وہ پاس کھڑے ہونے والوں پر چھڑک رہی تھی۔ سندر بھی اسی میز پر اپنی شرمیلی دولھن کو خستہ سموسے کھلا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مدن میرے کان میں پھسپھسائی۔

"آپا کیا رائے ہے شادی کر لوں؟"

"کس سے؟" میں نے اکتا کر پوچھا۔

"درشن سے، مرنا ہے حرامزادہ - کہتا ہے زہر کھا لوں گا تمہارے لئے"

وہ نئی دلہن کی طرح شرمائی۔

"ضرور کر لو۔ نیک کام میں دیر کیسی؟"

اس بات کو کتنے سال گزر گئے۔ مگر اس وقت تک جب کہ میں یہ آخری سطریں لکھ رہی ہوں، مدن کنواری ہے۔ اس کے سہرے کی کلیاں منہ بند ہیں۔ چمبور میں بنگلہ لینے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا وہ خوبصورت سا بنگلہ جہاں مدن بیگم بیٹھی ہیں۔ بچے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں

"اماں کھانا دو، اماں کھانا دو" اور وہ انہیں کفگیر سے مار رہی ہے۔

بچوں کا باپ مسکرا رہا ہے۔

"مارتی کیوں ہو بیگم، بچے ہیں!"

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی - ٹوٹی ہوئی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے - محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی سی بیٹھی ہوئی تھی - جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو - ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیے تھے - کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں، میرے لال"

دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو - بچے ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتے۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی

تھیں۔ چھوٹے عرض کی تول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے مگر ابھی سفید گزی کا نشان ہو نتے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی۔ کانٹ چھانٹ کے معاملے میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے۔ کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلے میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی۔ کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں، کان نکال لیتیں۔ کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھونٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھر تو نکل آئے گا۔ گریبان کے لئے کتر میری بقچی سے لے لو" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر دہ کتر نوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔ پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی اچھا تھا اور سب کو یقین تھا۔ کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی جب ہی تو سب کی سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکن نہ تھی۔ چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال تول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ اور اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہو گئیں جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھا لی۔

محلّے والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی، اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی تیز نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پرو دیئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبری کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔ سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی تھیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگ کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی تھیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبری کن انکھیوں سے ان لال لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ جھپکی سی اس کے زردی مائل رتیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری خندقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا۔ اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں اس شبنمی ڈوپٹے سے پہلے اور کتنے ڈوپٹے بنے۔ ٹکے تیار ہوئے اور لکڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کوریں ماند پڑ گئیں۔ طلونی کے لچھے اداس ہو گئے۔ مگر کبری کی بارات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا

ہو جاتا تو اُسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا۔ اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ نئی چھان بین کے ساتھ نئی اطلس چھانٹ جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلے کی عورتیں منہ میں پان اور بغل میں بچے دبائے جھانجھن بجاتی آ پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو نکل آئے گی۔ پر بچیوں کا کپڑا تو نکلے گا۔"

"لو تُوا اور سنو، تو کیا نگوڑی ماری نول کی بچیاں پڑیں گی۔"

اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھ کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑوں کے متعلق کھسر پسر کر کے قہقہے لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی سہاگ یا بنّا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی خیالی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی۔ بے ہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقع پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں

"اللہ یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے۔"

اس چہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی

الٹی کٹ جاتی - کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی کہ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا - جو کلی الٹی کٹ جائے۔ تو جان لو نئی نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا - یا تو دولھا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگڑا باندھے گی، جو گوٹ میں کان آ جائے یا مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا - چوتھی کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی، سگھڑاپا دھرا رہ جاتا نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی ــــ بسم اللہ کے روز سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا - ذرا سی کتر بچتی تو تیلے دانی یا شیشے کا غلاف سی کر، دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں - لڑکی کا کیا ہے - کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے - جو بارات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گذرے سلیقے کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے تھے! جیسے لمبے کہ محرم کا علم، ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا - صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے - پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا۔ اور وہ کھونستے ہی چلے جاتے - حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی - کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند

نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینے میں بے طرح الجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آکر انہیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے۔ ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکرانے لگتے ۔ کھانسی تو رک جاتی۔ مگر وہ دیر تک جیسے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے، کتنی بار کہا تم سے؟"

"بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے۔ سوئیاں لگواؤ۔ روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن کھاؤ۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی۔"

"دکھاؤں گا۔"

ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر......"

اور اب ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی؟ وہ تو بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناونی سن کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں پریاں ناچیں، نہ اس کے رخسارں

پر زلفیں پریشاں ہوئیں - نہ اس کے سینے میں طوفان اٹھے نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل کر پریتم یا ساجن مانگے وہ جھکی جھکی۔ سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی - ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی - میٹھا رس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کیلئے ضد کرنی چھوڑ دی - اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے - مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا - وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگ کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں - انہوں نے کہیں نہ کہیں سے جوڑ کر کے شرات کے مہینے میں کریپ کا ڈوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا - بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گذارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ اُن کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا تھا - بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا - جانو راحت نہیں، چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہو اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری - ہول سے اُن کے تو چھکے چھوٹ گئے - جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا۔

"بہن میرا ہی مرا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبری پر بھی ڈال لیتیں۔ جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشے کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشے سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبری نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا۔ مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے۔ دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اللہ، میرے اللہ میاں، اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔"

حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبری پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے۔ تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبری کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ! میں دھو دوں بی آپا۔ حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں۔" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریب کے ڈوپٹے پر لپو ٹانکتی رہیں۔ جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اس ہی راستے پھول۔ پتا اور چاندی کی پازیب بھی چل دیں اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی، جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے کوفتے بھنتے پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی،" وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں۔ اور وہ سوچا کرتی "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں، بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح کام پر جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے اور کیوں نہ بھر دے۔ آخر کو ایک دن وہ اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اسی کی ہتھیلی پر رکھے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا........؟ پھر ایک دن جب پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال سے میری بی آپا کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں

بجنے لگتیں اور راحت بھائی کے کمرے کو جھاڑتیں، ان کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں۔ جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ اس کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندی بنیائن، اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اس کے تیل میں چیچپاتے ہوئے تکیئے کے غلاف پر SWEET DREAM کاڑھتیں پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح سویرے انڈے پراٹھے ڈٹ کر جاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا۔ اور بی اماں کی منہ بولی بہن کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ پر بھئی تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"ئے توج، خدا نہ کرے جو میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا کسی نے"۔ بی اماں فخر سے کہتیں

بی آپا میری طرف دیکھ کر ہنستیں" اری چل ری دیوانی"

"ہائے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات کیوں نہیں کرتی اکل کھری؟"

"بھیا ہمیں تو شرم آتی ہے"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی کھائے گا نا"۔ بی اماں چڑ کر بولتیں۔

"نہیں تو..... مگر....." میں لاجواب ہو گئی۔

اور پھر مسکوٹ گئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے
بہنوئی سے مذاق کرنے کے لئے اس دن بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔

"چپکے سے بولیں: "دیکھو ہنسنا نہیں - نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا

"کھانا کھا لیجئے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر چوکی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت راحت
نے میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں سرپٹ بھاگی وہاں سے۔
میرا دل دھک دھک کرنے لگا: "اللہ توبہ! کیسا خناس آنکھیں
ہیں کمبخت کی۔"

"جانگوڑی ماری، اری دیکھ تو سہی - وہ کیسا منہ بناتا ہے - لے ہے
سارا مزہ کرکرا کر دیا۔"

بی اماں نے ٹوکا۔ مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔

آپا جی نے ایک بار میری طرف دیکھا - اُن کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی
ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی - میں
سر جھکائے جا کر پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے - میری طرف نہ دیکھا کھلی کے کباب
کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی
واہ دولھا بھائی کھلی کھا رہے ہیں۔" مگر جیسے کسی نے میرا نرخرہ دبوچ
لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں کوسنے لگیں اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے۔ کمبخت کہیں مجھے بھی نہ کھا جائے۔

"راحت بھائی، کوفتے پسند آئے؟"

بی اماں کے سکھانے پر پوچھنا پڑا۔

جواب ندارد!

"بتائیے نا!"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھا لئے۔ مزے دار ہی ہوں گے"۔

"ارے واہ رے جنگلی۔" بی اماں سے نہ رہا گیا تو بول اٹھیں۔ "تمہیں پتہ بھی نہ چلا۔ کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے...... ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہوں کھلی اور بھوسا کھانے کا۔" راحت نے چپکے سے کہا۔

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں پھر نہ اٹھ سکیں دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دوگنی سلائی کی اور پھر شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے۔

"کہیئے، آج کیا لائی ہیں، آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا۔" میں نے جل کر کہا

"یہ بات نہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو

کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کر اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ کبھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کا منہ بولی بہن کا بتایا ہوا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی گذارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھنکی رہتیں بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا۔ کھانا کھاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا، صاف کہہ دوں کسی کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس ارے بی مجھ سے تمہارا بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ.....

نہیں!........ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے دبا دیئے۔ "ناس جائے اس کمبخت نزلے کا بے چاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔"

راحت نے پھر کسی بہانے سے پکارا

"اونہہ"۔ میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں۔" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری

کلائی پکڑلی - میرا دم نکل گیا اور بھاگی ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے ؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی - کیا کہتی۔

"کہہ رہے تھے - کس نے پکایا ہے کھانا - واہ واہ - جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں - پکانے والوں کے ہاتھ کھا جاؤں ...... اوہ .... نہیں .... کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں" میں نے کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیئے کی بساند میں سڑتا ہوا ہاتھ اپنے گال سے لگا لیا - میرے آنسو نکل آئے - "یہ ہاتھ" میں نے سوچا "جو صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں - ان کی بیگار کب ختم ہوگی - کیا ان کا کوئی خریدار نہیں آئے گا ؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہیں چومے گا ؟ —— کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی ...... ؟" کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہیں بسے گا .... ؟" جی چاہا ، زور سے چیخ پڑوں۔

اور "کیا کہہ رہے تھے" ؟

بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے - پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ راحت کے کان ہوتے تو ...... مگر راحت کے کان نہ تھے ، نہ ناک ، بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

" اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔

"چل جھوٹی" !

"ارے واہ بھوتے ہوں گے آپ آپ کے وہ......"

"اری چپ مُردار"۔ انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے، انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم، میرا نام نہ لیجیو"۔

"نہیں بی آپا۔ اُنہیں نہ دو سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے"۔ میں نے کہنا۔ پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی، تم خود کیا پہنو گے؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھُلسن رہتی ہے"۔

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے تان کر کہا۔

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو"۔

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے"

میرا جی چاہا۔ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے مٹی کے تودے یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں، اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوتی ہیں یہ اُن ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو پنگوڑے جھلانے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ٹوٹا ٹانکنے اور پھٹا ہوا دامن رفو کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو۔ گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے

تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار نہ بجا سکیں گے۔ منی پور اور بھارت ناٹیم نہ دکھا سکیں گے انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا، انہیں پھولوں سے کھیلنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دئے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں۔ میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔" مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں، کیسی ڈراونی موت کی باتیں۔ بھوک اور کال کی باتیں، دھڑکتے ہوئے دلوں کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔"

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔" جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔

بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھو لئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"کیا بولے؟" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا
"بی آپا - یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔"

میں نے سوچا، آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں

"مجھے اچھی نہیں لگتے ...... یہ دیکھئے ...... میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں"۔ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں"۔ انہوں نے رومانٹک آواز میں کہا۔

"بی آپا ـــ سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں ہیں"۔ میں نے سلگ کر کہا۔ "آج بی اماں سے کہہ دوں گی"۔

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے پوچھا۔

دیکھیئے میری چوڑیاں، بی اماں"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں"

"خوب کیا۔ تو اُسے ستاتی بھی بہت ہے۔ اے ہے تو دم کا ہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہو۔ ذرا ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں"۔ پھر چمکار کر بولیں "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد کریں میاں جی"

یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرا دیا گیا۔

"اے ہے۔ تو تو بڑی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے"۔ منہ بولی بہن بولیں۔

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے ہتھکنڈے بتانے لگیں۔
کہ کس طرح انہوں نے چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے میری ان دو
بہنوں کی شادی کرائی تھی۔ جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے مواقع ہاتھ سے
نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے۔ جہاں بے چارے کو
لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے
دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی
میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کہ باہر آئے
ہیں، لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے
بھیجدیں۔ کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کے کھلا دیا۔

"اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے۔ پانی آئے۔ کیا مجال
جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان سے کہا
کہ ان کے ہاں شادی کرا دو ۔۔۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے ؟"
کہا :" کسی سے بھی کرا دو ۔" اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بڑی بہن
کی صورت یہ تھی۔ کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا جاتا ہے۔ چھوٹی تو بس
سبحان اللہ، ایک آنکھ لو پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولہ سونا دیا ہے
باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"
" ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب
کے دفتر کی نوکری۔ اسے لڑکا ملتے ہی کیا دیر لگتی ہے"! بی اماں نے

ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

"مگر راحت تو بینگن نہیں، اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ پر کہیں میں ہی پس نہ جاؤں۔" میں نے سوچا۔

میں نے پھر بی آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ اُن کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں، وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں امنگ بن کر نہیں ابھرا۔ بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو دھکیلنا ہی ہوگا۔

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود ہی پھوٹے نہ اُن کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کے بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھڑی میں اپنے خون کی آخری بوند چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں سہ دری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی

ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی نکل جائیں گی آج ان کی جھرلیوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل اٹھا کر نیاز کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔"

ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں آنے لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ "مولوی صاحب نے دم کیا ہے....

... یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا ہے یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔" میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولھا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہوا ہے۔ جو گھوڑے کے ایالوں کو چوم رہا ہے۔.

...... چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں۔ چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے۔ بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اٹھتی ہیں۔ شکریے کا آنسو افشاں

کے ذرّوں میں قہقہے کی طرح اُلجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری محبت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے ...... حمیدہ کا گلا بھر آیا......

"جاؤ نا میری بنو" آپا نے اُسے جگا دیا اور چونک کر وہ اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ...... یہ ملیدہ،" اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پہاڑ کھسکا۔ راحت نے منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی۔ جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کوہ میں ڈوبتا چلا گیا...... نیچے، بہت نیچے تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین کے گرد کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی۔ باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ

ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی اس کے بعد اس گھر میں انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ پکے اور سوئٹر نہ بنے گئے۔ دق جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے آ رہی تھی۔ ایک ہی جست میں انہیں دبوچ بیٹھی اور انہوں نے سر جھکا کر اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان ندیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے اُن کے چہرے پر بھیانک سکون اور موت بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ اور جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے گا۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر سفید گزی کا نشان۔ اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا ارمان رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے۔

اور پھر ایک دم سب خاموش ہو گئے ——

بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کر توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو اُن کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا۔ کہ کبرے کا جوڑا بن کے تیار ہو گیا اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

چٹان

بھابی بیاہ کر آئی تھی تو مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ بڑھوار بھی تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ بھیّا کی صورت سے ایسی لرزتی تھی جیسے قصائی سے گائے۔ مگر سال بھر کے اندر ہی وہ تو جیسے مُنہ بند کلی سے کھل کر پھول بن گئی۔ جسم بھر گیا۔ بال گھمیرے ہو گئے۔ آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت دور ہو کر غرور اور شرارت بھر گئی۔

بھابی ذرا آزاد قسم کے خاندان سے تھی، کانونیٹ میں تعلیم پائی تھی پچھلے سال اس کی بڑی بہن ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس لئے اس کے ماں باپ نے ڈر کر جلدی سے اُسے کانونیٹ سے اٹھا لیا اور چٹ پٹ شادی کر دی۔

بھابی آزاد فضا میں پلی تھی۔ ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے کی عادی

تھی ۔ مگر سسرال اور میکہ دونوں طرف سے اس پر کڑی نگرانی تھی اور بھیاؔ کی بھی یہی کوشش تھی کہ اگر جلدی سے اسے پکّی گھرستن نہ بنایا گیا تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی گل کھلائے گی ۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھی ۔ لہٰذا وہ اُسے گھرستن بنانے پر جُٹ گئے ۔

چار پانچ سال کے اندر بھابی کو گھِس گھِسا کے واقعی سب نے گھرستن بنا دیا ۔ وہ تین بچوں کی ماں بن کر بھدّی اور ٹھس ہو گئی ۔ امّاں اسے خوب مُرغی کا شوربا ، گوند سٹورے کھلاتیں ۔ بھیاؔ ٹانک پلاتے اور ہر بچے کے بعد وہ دس پندرہ پونڈ بڑھ جاتی ۔

آہستہ آہستہ اُس نے بننا سنورنا چھوڑ ہی دیا تھا ۔ بھیاؔ کو لپ اسٹک سے نفرت تھی ۔ آنکھوں میں منوں کاجل اور مسکارا دیکھ کر وہ چڑ جاتے ۔ بھیاؔ کو بس گلابی رنگ پسند تھا یا پھر سرخ ـــــ بھابھی زیادہ تر گلابی یا سرخ ہی کپڑے پہنا کرتی تھی ۔ گلابی ساڑھی پر سرخ بلاؤز یا کبھی گلابی کے ساتھ ہلکا گہرا گلابی ۔

شادی کے وقت اُس کے بال کٹے ہوئے تھے ۔ مگر دولہن بناتے وقت ایسے تیل چپڑ کر باندھے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پر کٹی میم ہے ۔ اب اس کے بال تو بڑھ گئے تھے لیکن پے در پے بچے ہونے کی وجہ سے وہ ذرا گنجی سی ہو گئی تھی ۔ ویسے بھی وہ بال کس کر میلی دھجّی ہی باندھ لیا کرتی تھی ۔ اس کے میاں کو وہ میلی کچیلی ایسی ہی بڑی پیاری لگتی تھی ۔ اور میکے سسرال والے بھی اس کی سادگی کو دیکھ کر

اس کی تعریفوں کے گُن گاتے تھے ۔ بھابھی تھی بڑی پیاری سی ۔ سجل نقشہ ۔ مکھن جیسی رنگت ، سڈول ہاتھ پاؤں ۔ مگر اُس نے اس بُری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا کہ خمیری آٹے کی طرح بہہ گئی تھی ۔

بھیّا اس سے نو برس بڑے تھے ، مگر اُس کے سامنے لونڈے سے لگتے تھے ۔ ویسے ہی سڈول کسرتی بدن والے ، روز ورزش کرتے بڑی احتیاط سے کھانا کھاتے ، بڑے حساب سے سگریٹ پیتے یونہی کبھی وہسکی بیر چکھ لیتے ۔ ان کے چہرے پر اب بھی لڑکپن تھا ۔ تھے بھی تیس اکتیس برس کے ۔ مگر چوبیس پچیس برس کے ہی لگتے تھے ۔

اُف بھیّا کو جین اور اسکرٹ سے کیسی نفرت تھی انھیں یہ نئے فیشن کی بے آستینوں کی بدن پر چپکی ہوئی قمیص سے بھی بڑی گھن آتی تھی ۔ تنگ موری کی شلواروں سے تو وہ ایسے جلتے تھے کہ توبہ ۔ خیر ، بھابی بیچاری تو شلوار قمیص کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی وہ تو بس زیادہ تر بلاؤز اور پیٹی کوٹ پر ڈریسنگ گاؤن چڑھائے گھوما کرتی ۔ کوئی جان پہچان آجاتا تو بھی بے تکلفی سے وہی اپنا نیشنل ڈریس پہنے رہتی ۔ کوئی پُر تکلف مہمان آتا تو عموماً وہ اندر ہی بچوں سے سر مارا کرتی ۔ جو کبھی باہر آنا پڑتا تو ملگجی سی ساڑھی لپیٹ لیتی ۔ وہ گھرہستن تھی ، ماں تھی ، بہو تھی اور چہیتی تھی ، اسے رنڈیوں کی طرح بن سنور کسی کو لبھانے کی کیا ضرورت تھی ۔

اور شاید بھابھی یونہی گودڑ بنی ادھیڑ اور پھر بوڑھی ہو جاتی بہوئیں بیاہ کر لاتی جو صبح اٹھ کر اسے جھک کر سلام کرتیں گود میں پوتا کھلانے کو دیتیں۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شام کا وقت تھا، ہم سب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے بھابی پاپڑ تلنے باورچی خانہ میں گئی تھی۔ باورچی نے پاپڑ لال کر دئے بھیا کو بادامی پاپڑ بھاتے ہیں۔ انہوں نے پیار سے بھابی کی طرف دیکھا اور وہ جھٹ سے اُٹھ کر پاپڑ تلنے چلی گئی ہم لوگ مزے سے چائے پیتے رہے۔ ہائے بھابی تھی کہ فرشتہ۔ میں تو کالج سے آکر باورچی خانہ میں جانے پر کسی طرح مجبور ہی نہیں کی جا سکتی تھی اور نہ ہی میرا شام کا پر تکلف لباس باورچی خانہ کے لئے موزوں تھا اس کے علاوہ مجھے پاپڑ تلنا ہی کب آتے تھے۔ دوسری بہنیں بھی میری قطار میں کھڑی تھیں۔ فریدہ کا منگیتر آیا تھا وہ اس کی طرف جٹی ہوئی تھی، رضیہ اور شمیم اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لڑانے میں مصروف تھیں وہ کیا پاپڑ تلتیں اور ہم سب تو بابل کے آنگن کی چڑیاں تھیں اور اُڑنے کے لئے پر تول رہی تھیں۔

دھائیں سے فٹ بال آکر عین بھیا کی پیالی پر پڑی۔ ہم سب اچھل پڑے بھیا مارے غصّہ کے بھنّا اٹھے۔

"کون پاجی ہے؟" انہوں نے جدھر سے گیند آئی تھی ادھر دیکھ کر ڈانٹا۔ بکھرے ہوئے بالوں کا گول مول سر اور بڑی بڑی آنکھیں اوپر سے جھانکیں ایک زقند میں بھیا منڈیر پر تھے اور مجرم کے بال ان کی گرفت میں۔

"اوہ!" ایک چیخ گونجی اور دوسرے لمحے بھیا ایسے اُچھل کر الگ ہو گئے جیسے انہوں نے بچھو کے ڈنک پر ہاتھ ڈال دیا ہو۔ یا انگارہ پکڑ لیا ہو۔

"سوری — آئی ایم ویری سوری —" وہ ہکلا رہے تھے۔ ہم سب دوڑ کر گئے۔ دیکھا تو منڈیر کے اس طرف ایک دبلی پتلی ناگن سی لڑکی سفید ڈریں پائپ اور نیبو کے رنگ کا سلیو لیس بلاؤز پہنے اپنے میرلین منرو کی طرح کٹے ہوئے بالوں میں پتلی پتلی انگلیاں پھیر کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی۔ اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔

بھابی پاپڑوں کی پلیٹ لئے اندر سے نکلی اور بغیر پوچھے گچھے یہ سمجھ کر ہنسنے لگی کہ ضرور کوئی ہنسی کی بات ہو گی ہی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا پیٹ ہنستے ہی پھُدکنے لگا اور جب اسے معلوم ہوا کہ بھیا نے شبنم کو لونڈا سمجھ کر اس کے بال پکڑ لئے تو وہ اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ کہ کئی پاپڑ کے ٹکڑے گھاس پر بکھر گئے۔ شبنم نے بتایا۔ وہ اسی دن اپنے چچا خالد جمیل کے ہاں آئی ہے اکیلے جی گھبرایا تو فٹ بال ہی لڑھکانے لگی جو قسمت سے بھیا جی کی پیالی پر آن کودی۔

شبنم بھیا کو اپنی تیکھی مسکارہ لگی آنکھوں سے گھور رہی تھی بھیا مسحور سناٹے میں اسے تک رہے تھے ایک کرنٹ اُن دونوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔ بھابی اس کرنٹ سے کٹی ہوئی جیسے کوسوں دور کھڑی تھی اسکا پھُدکتا ہوا پیٹ سہم کر رُک گیا ہنسی نے اسکے ہونٹوں پر لڑکھڑا کر دم توڑ دیا

پلیٹ ٹیڑھی ہو کر پاپڑ گھاس پر گرنے لگے۔ پھر ایک دم وہ دونوں جاگ پڑے اور خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

شبنم پھدک کر منڈیر پر چڑھ گئی۔

"آیئے چائے پی لیجئے"۔ میں نے ٹھہری ہوئی فضا کو دھکا دے آگے کھسکایا۔

ایک لچک کے ساتھ شبنم نے اپنے پیر منڈیر کے اس پار سے اس پار جھلائے۔ سفید چھوٹے چھوٹے مکاسن ہری گھاس پر فاختہ کے جوڑے کی طرح ٹھمکنے لگے۔ شبنم کا رنگ پگھلے ہوئے سونے کی طرح لو دے رہا تھا۔ اس کے بال سیاہ بھونرا تھے۔ مگر آنکھیں جیسے سیاہ کٹوریوں میں کسی نے شہد بھر دیا ہو۔ نیبو کے رنگ کے بلاؤز کا گلا بہت گہرا تھا۔ ہونٹ تربوزی رنگ کے اور اسی رنگ کی نیل پالش لگائے وہ بالکل کسی امریکی اشتہار کا موڈل معلوم ہو رہی تھی۔ بھابی سے کوئی فٹ بھر لانبی لگ رہی تھی۔ حالانکہ مشکل سے دو انچ اونچی ہوگی۔ اس کی ہڈی بڑی نازک تھی۔ اس لئے کمر تو ایسی کہ چھلے میں پرو لو۔

بھیا گم سم سے بیٹھے تھے۔ بھابی انہیں ایسے تاک رہی تھی جیسے بلّی پر تولتے ہوئے پرندے کو گھورتی ہے کہ جیسے ہی پر پھڑپھڑائے بڑھ کر دبوچ لے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اتنے میں منّا آ کر اس کی پیٹھ پر دھم سے کودا وہ ہمیشہ اس

کی پیٹھ پر ایسے کودا کرتا تھا۔ جیسے وہ کوئی گدگدا سا تکیہ ہو۔ بھابی ہمیشہ ہی ہنس دیا کرتی تھی۔ مگر آج اسنے چٹاخ پٹاخ دو چار چانٹے جڑ دئے۔

شبنم پریشان ہو گئی۔

"ارے ارے —— رو کیئے نا ——" اس نے بھیا کا ہاتھ چھو کر کہا۔

"بڑی غصہ ور ہیں آپ کی ممی ——" اس نے میری طرف منہ پھیر کر کہا انٹروڈکشن ہماری سوسائٹی میں بہت کم ہوا کرتا ہے اور پھر بھابھی کا کسی سے انٹروڈکشن کرانا عجیب سا لگتا ہے۔ وہ تو صورت سے ہی گھر کی بہو لگتی تھی۔ شبنم کی بات پر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بھابھی منے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر چلدی۔

"ارے یہ تو ہماری بھابھی ہے"۔ میں نے بھابھی کو دھم دھم جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"بھابی ؟" شبنم حیرت زدہ ہو کر بولی

"ان کی بھیا کی بیوی"۔

"اوہ ——" اس نے سنجیدگی سے اپنی نظریں جھکا لیں "میں میں سمجھی" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بھابی کی عمر تیئیس سال ہے" میں نے وضاحت کی۔

"مگر...... ڈونٹ بی سلی ——" شبنم ہنسی —— بھیا بھی اٹھ کر چل دیئے۔

"خدا کی قسم"

"اوہ ——— جہالت ——"

"نہیں ——— بھابی نے مارٹینز سے پندرہ سال کی عمر میں سینئر کیمرج کیا تھا۔

"تمھارا مطلب ہے۔ یہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہیں ——— میں چھتیس سال کی ہوں۔"

"تب تو قطعی چھوٹی ہیں۔"

"اُف، اور میں سمجھی وہ تمہاری ممی ہیں۔ در اصل میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں۔ مگر مجھے عینک سے نفرت ہے بُرا لگا ہوگا انہیں؟"

"نہیں ——— بھابی کو کچھ بُرا نہیں لگتا۔"

"چہ۔ بیچاری"

"کون ——— بھابی؟" نا جانے میں نے کیوں کہا۔

"بھیا اپنی بیوی پر جان دیتے ہیں۔" صفیہ نے بطور وکیل کہا۔

"بے چارے کی بہت بچپن میں شادی کر دی گئی ہوگی۔"

"پچیس چھبیس سال کے تھے؟"

"مگر مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ بیسویں صدی میں بھی بغیر دیکھے، شادیاں ہوتی ہیں۔" شبنم نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"تمھارا ہر اندازہ غلط نکل رہا ہے ..... بھیا نے بھابی کو دیکھ کر بے حد پسند کر لیا تھا۔ تب شادی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ کنول کے پھول جیسی نازک اور حسین تھی!"

"پھر یہ کیا ہو گیا شادی کے بعد؟"

"ہونا کیا ـــــ بھابی اپنے گھر کی ملکہ ہیں - بچوں کی ملکہ ہیں - کوئی فلم ایکٹریس تو ہیں نہیں ـــــ دوسرے بھیا کو سوکھی ماری لڑکیوں سے گھن آتی ہے"۔ میں نے جان کر شبنم پر چوٹ کی - وہ بے وقوف نہ تھی -

"بھئی چاہے مجھ سے کوئی پیار کرے یا نہ کرے - میں تو کسی کو خوش کرنے کے لیئے ہاتھی کا بچہ نہ بنوں ـــــ اوہ معاف کرنا - تمھاری بھابی کبھی خوب صورت ہوں گی - مگر اب تو ......"

"اُنھ ، آپ کا نکتہ نظر بھیا سے بالکل مختلف ہے - میں نے بات ٹال دی اور جب وہ بل کھاتی سیدھی سڈول ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلاتی ننھے ننھے قدم رکھتی منڈیر کی طرف جا رہی تھی - بھیا برآمدے میں کھڑے تھے ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور بار بار اپنی گدی سہلا رہے تھے جیسے کسی نے وہاں جلتی جلتی آگ رکھ دی ہو - چڑیا کی طرح پھدک کر وہ منڈیر پھلانگ گئی پل بھر کو پلٹ کر اس نے اپنی شربتی آنکھوں سے بھیا کو تولا اور چھلاوہ کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گئی -

بھابی لان پر جھکی ہوئی پیالیاں سمیٹ رہی تھی - مگر اس نے ایک نظر نہ آنے والا تار دیکھ لیا - جو بھیا جی اور شبنم کی نگاہوں کے درمیان دوڑ رہا تھا -

ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا - شبنم پھولا ہوا لال اسکرٹ

اور سفید کھلے گلے کا بلاؤز پہنے پپو کے ساتھ سمبا ناچ رہی تھی۔ اس کا ننھا سا پکنیز کتا ٹانگوں میں الجھ رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی اس کی سڈول سانولی ٹانگیں ہری ہری گھاس پہ تھرک رہی تھیں۔ سیاہ ریشمی بال ہوا میں چھلک رہے تھے۔ پانچ سال کا پپو بندر کی طرح پھدک رہا تھا۔ مگر وہ تیلی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اس نے ناچتے ناچتے ناک پر انگوٹھا رکھ کر مجھے چڑایا۔ میں نے جواب میں گھونسا دکھا دیا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی نگاہوں کا پیچھا کر کے معلوم ہوا یہ اشارہ وہ میری طرف نہیں کر رہی تھی۔ بھیا برامدے میں احمقوں کی طرح کھڑے گدھی سہلا رہے تھے۔ اور وہ انھیں منہ چڑا کر جلا رہی تھی۔ اس کی کمر میں بل پڑ رہے تھے۔ کولھے مٹک رہے تھے۔ بانہیں تھر تھرا رہی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جدا لرز رہے تھے۔ اس نے سانپ کی طرح لپ سے زبان نکال کر اپنے ہونٹ کو چاٹا۔ بھیا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا —— بھابی گودام میں اناج تلوا کر باورچی کو دے رہی تھی۔

"شبنم کی بچی ——" میں نے دل میں سوچا —— مگر غصہ مجھے بھیا پر بھی آیا۔ انھیں دانت نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ انھیں تو شبنم جیسی کرنٹیوں سے نفرت تھی۔ انھیں تو انگریزی ناچوں سے گھن آتی تھی پھر وہ کیوں کھڑے اسے تک رہے تھے۔ اور ایسی بھی کیا بے سدھی

کہ اُن کا جسم سنبا کی تال پر لرز رہا تھا اور انھیں خبر نہ تھی۔

اتنے میں بوائے چائے کی ٹرے لے کر لان پر آ گیا —— بھیا نے ہم سب کو آواز دی۔ اور بوائے سے کہا بھابی کو بھیجدے۔

رسماً شبنم کو بھی بُلا وا دینا پڑا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا قطعی اس کی طرف سے مُنہ پھیر کر بیٹھ جاؤں مگر جب وہ مُنّے کو پڈّھی پر چڑھائے منڈیر پر پھلانگ کر آئی۔ تو نہ جانے کیوں مجھے وہ قطعی معصوم لگی، مُنّا اس کا رف لگاموں کی طرح تھامے ہوئے تھا۔ اور وہ گھوڑے کی چال اُچھلتی ہوئی لان پر دوڑ رہی تھی۔ بھیا نے مُنّے کو اس کی پیٹھ سے اتارنا چاہا۔ مگر وہ اور چمٹ گیا۔

"ابھی اور گھوڑا چلے آنٹی"

"نہیں بابا —— آنٹی میں دم نہیں ——" شبنم چلائی۔ بڑی مشکل سے مُنّے کو بھیا نے اتارا۔ مُنہ پر ایک چانٹا لگایا۔ ایک دم تڑپ کر شبنم نے اسے گود میں اُٹھا لیا اور بھیا کے ہاتھ پر زور کا تھپیڑ لگایا۔

"شرم نہیں آتی —— اتنے بڑے اونٹ کے اونٹ ذرا سے بچے پر ہاتھ اُٹھاتے ہیں" بھابھی کو آتا دیکھ کر اس نے مُنّے کو ان کی گود میں دے دیا۔ اس کا چانٹا کھا کر بھیا مسکرا رہے تھے۔

"دیکھئے تو کتنی زور سے تھپڑ مارا ہے۔ میرے بچے کو کوئی مارتا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دیتی" اس نے شربت کی کٹوریوں میں زہر گھول کر بھیا کو دیکھا۔

"اور پھر ہنس رہے ہیں بلے حیا"

"ہوں۔ دم بھی ہے —— جو ہاتھ توڑو گی ——" بھیا نے اُس کی

کلائی مروڑی۔ وہ بل کھا کر اتنی زور سے چیخنی کہ بھیا نے لرز کر اُسے چھوڑ دیا۔ اور وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی۔ پائے کے درمیان بھی شبنم کی شرارتیں چلتی رہیں وہ بالکل کمسن چھوکریوں کی طرح چہلیں کر رہی تھی۔ بھابی گم سم بیٹھی تھیں۔ آپ سمجھے ہوں گے۔ شبنم کے وجود سے ڈر کر اُنھوں نے کچھ اپنی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہو گی بجی قطعی نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ میلی رہنے لگی۔ پہلے سے بھی زیادہ کھاتیں۔ ہم سب تو ہنس زیادہ رہے تھے۔ مگر وہ سر جھکائے نہایت انہماک سے کیک اڑانے میں مصروف تھیں۔ چٹنی لگا لگا کر بھجیئے نگل رہی تھیں سیکے ہوئے توسوں پر ڈھیر سا مکھن اور جیلی تھوپ کر دے کھائے جا رہی تھیں۔ بھیا اور شبنم کو دیکھ دیکھ کر ہم سب ہی پریشان تھے۔ اور شاید بھابھی بھی فکر مند ہوں گی مگر وہ اپنی پریشانی کو مرغن کھانوں میں دفن کر رہی تھیں۔ انھیں ہر وقت کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں۔ مگر وہ چورن کھا کھا کر پلاؤ قورمہ ہضم کرتیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے بھیا جی اور شبنم کو ہنستا بولتا دیکھتیں۔ بھیا تو کچھ اور بھی لونڈے سے لگنے لگے تھے۔ شبنم کے ساتھ وہ صبح و شام سمندر میں تیرتے۔ بھابھی اچھا بھلا تیرنا جانتی۔ مگر بھیا کو سوئمنگ سوٹ پہنی عورتوں سے بہت نفرت تھی۔ ایک دن ہم سب سمندر میں نہا رہے تھے۔ شبنم ننھی ننھی دو دھجیاں پہنے ناگن کی طرح پانی میں بل کھا رہی تھی۔ اتنے میں بھابی جو دیر سے منّے کو پکار رہی تھیں۔ آ گئیں۔ بھیا شرارت کے موڈ میں تو تھے ہی، دوڑ کر انہیں

پکڑ لیا اور ہم سب نے مل کر انھیں پانی میں گھسیٹ لیا جب سے
شبنم آئی تھی بھیّا بہت شریر ہو گئے تھے۔ ایک دم سے وہ دانت
کچکچا کر بھابی کو ہم سب کے سامنے بھینچ لیتے۔ انھیں گود میں اٹھانے
کی ہر کوشش کرتے مگر وہ ان کے ہاتھوں میں سے بونبل مچھلی کی طرح
پھسل جاتیں۔ پھر وہ کھسیا کر رہ جاتے۔ جیسے تخیّل میں وہ شبنم ہی
کو اٹھا رہے تھے۔ اور بھابی کٹی گائے کی طرح نادم ہو کر فوراً پڈنگ
یا کوئی اور مزے دار ڈش تیار کرنے چلی جاتیں اس وقت جو انھیں پانی
میں ڈھکیلا گیا تو وہ گٹھڑی کی طرح لڑھک گئیں۔ ان کے پاس کپڑے
جسم پر چپک گئے اور ان کے جسم کا سارا بھونڈا پن بھیانک طریقہ پر
ابھر آیا۔ کمر پہ جیسے کسی نے توشک لپیٹ دی تھی۔ کپڑوں میں وہ
اتنی بھیانک نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

"اُفوہ کتنی موٹی ہو گئی ہو گئی ہو تم" بھیّا نے ان کے کولہے کا بوٹا پکڑ
کر کہا۔ "اُف توند تو دیکھو ——— بالکل گاما پہلوان معلوم ہو رہی ہو"

"ہنہہ چار بچے ہونے کے بعد کمر ———"

"میرے بھی تو چار بچے ہیں ——— میری کمر تو ڈنلو پلو کا گدا نہیں بنی"
انھوں نے اپنے سڈول جسم کو ٹھوک بجا کر کہا۔ اور بھابی منہ تھوتھائے
بھیگی مرغی کی طرح پیر مارتی جھرجھر۔ بال لپیٹتی ریت میں گھرے گھرے گڈھے
بناتی منّے کو گھسیٹتی چلی گئیں۔ بھیّا بالکل بے توجہ ہو کر شبنم کو پانی میں
ڈبکیاں دینے لگے۔ مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ ایسا اڑنگا لگایا کہ غڑاپ

سے اوندھے مُنہ گر پڑے۔

جب نہاکر آئے تو بھابی سر جھکائے خوبانیوں کے مُربّہ پر کریم کی تہہ جمارہی تھیں، ان کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور آنکھیں سُرخ تھیں۔ گٹّا پارچہ کی گرُھ یا جیسے موٹے موٹے گال کچھ اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ لنچ پر بھابی بے انتہا غمگین تھیں۔ لہٰذا بڑی تیزی سے خوبانیوں کا مُربّہ اور کریم کھانے پر جُٹی ہوئی تھیں۔ شبنم نے ڈش کی طرف دیکھ کر ایسے پھُریری لی جیسے خوبانیاں نہ ہو سانپ بچھو ہوں۔

"زہر ہے زہر!" اس نے نفاست سے کگڑی کا ٹکڑا کترتے ہوئے کہا۔ اور بھیّا بھابھی کو گھورنے لگے۔ مگر وہ شپا شپ مُربّہ اُڑاتی رہیں "حد ہے!" انھوں نے نتھنے پھڑکا کر کہا۔

بھابی نے کوئی دھیان نہ دیا۔ اور قریب قریب پوری ڈش پیٹ میں انڈیل لی۔ انھیں مُربّہ سپوڑتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رشک و حسد کے طوفان کو روکنے کے لئے بند باندھ رہی ہوں۔ یہ کریم چربی کی چٹانوں کی صورت میں ان کے جسم کے قلعے کو ناقابل تسخیر بنا دے گی۔ پھر شاید دل میں یوں ٹیسیں نہ اٹھیں گی۔ بھیّا جی اور شبنم کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ٹکراؤ سے بھڑکنے والے شعلے ان پتھریلی دیواروں کو نہ پگھلا سکیں گے۔

"خدا کے لئے بس کرو ـــــ ڈاکٹر بھی منع کر چکا ہے۔ ایسا بھی کیا چٹور پن۔"

بھیّا نے کہہ ہی دیا، موم کی دیوار کی طرح بھابی پگھل گئیں۔ بھیّا

کا نشتر چربی کی تہوں کو چیرتا ہوا ٹھیک دل میں اُتر گیا۔ موٹے موٹے آنسو بھابی کے پھولے ہوئے گالوں پر پھسلنے لگے۔ سسکیوں نے جسم کے ڈھیر میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دُبلی پتلی نازک لڑکیاں کس لطیف اور سہانے انداز میں روتی ہیں۔ مگر بھابی کو روتے دیکھ کر بجائے دُکھ کے ہنسی آتی تھی۔ جیسے کوئی روئی کے بھیگے ہوئے ڈھیر کو ڈنڈوں سے پیٹ رہا ہو۔

وہ ناک پونچھتی ہوئی اُٹھنے لگیں۔ مگر ہم لوگوں نے روک لیا۔ اور بھیّا کو ڈانٹا خوشامد کر کے واپس انھیں بٹھالیا۔ بیچاری ناک سڑکاتی بیٹھ گئیں۔ مگر جب انہوں نے کافی میں تین چمچہ شکر ڈال کر کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک دم ٹھٹک گئیں۔ سہمی ہوئی نظروں سے شبنم اور بھیّا کی طرف دیکھا۔ شبنم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھی۔ بھیا مارے غصہ کے روہانسے ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم بھنا کر اٹھے اور جا کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حالات اور بگڑے۔ بھابی نے کُھلّم کُھلّا اعلان جنگ کر دیا۔ کسی زمانے میں بھابی کا پٹھانی خون بہت گرم تھا۔ ذرا سی بات ہاتھا پائی پر اُتر آیا کرتی تھیں اور بارہا بھیا سے غصہ ہو کر بجائے منہ پھیلانے کے وہ خونخوار بلّی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑتیں۔ ان کا منہ کھسوٹ ڈالتیں۔ دانتوں سے گریبان کی دھجّیاں اڑا دیتیں۔ پھر بھیّا انھیں اپنی باہوں میں جکڑ کر بے بس کر دیتے اور وہ ان کے سینے سے لگ کر پیاسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ پھر ملاپ ہو جاتا۔ اور جھینپی کھسیانی وہ بھیّا کے منہ پر لگے ہوئے کھرونچوں پر پیار سے ٹنکچر لگا دیتیں

ان کے گریبانوں کو رفو کرتیں اور میٹھی میٹھی شکر گزار آنکھوں سے انہیں تکتی رہتیں۔

یہ تب کی بات ہے جب بھابی ہلکی پھلکی تیتری کی طرح طرار تھیں اڑتی ہوئی کٹتی سی پشمی بلی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیا کو اُن پر غصہ آنے کے بجائے اور شدت سے پیار آتا تھا۔ مگر جب سے اُن پر گوشت نے جھاد بول دیا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ اُنھیں اوّل تو غصہ ہی نہ آتا۔ اور اگر آتا بھی تو فوراً اِدھر اُدھر کام میں لگ کر بھول جاتیں۔

اس دن اُنھوں نے اپنے بھاری بھر کم ڈیل کو بھول کر بھیا پر حملہ کر دیا۔ بھیا صرف اُن کے بوجھ دھکا کھا کر دیوار سے جا چپکے۔ روئی کے گٹھڑ کو یوں لڑھکتے دیکھ کر اُنھیں سخت گھن آئی۔ نہ غصہ ہوئے، نہ بگڑے۔ شرمندہ اُداس سر جھکائے کمرے سے نکل بھاگے۔ بھابھی وہیں پسر کر رونے لگیں۔

بات اور بڑھی اور ایک دن بھیا کے سالے آ کر بھابی کو لے گئے طفیل بھابی کے چچا زاد بھائی تھے۔ اُنھیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح اُن سے لپٹ کر رونے لگیں، انھوں نے بھابھی کو پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ وہ گول گنبد کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے سناٹے میں آ گئے۔ پھر انہوں نے بھابھی کو ننھی بچی کی طرح سینے سے لگا لیا۔ بھیا اس وقت شبنم کے ساتھ کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ طفیل نے شام تک اُن کا انتظار کیا۔ وہ نہ آئے تو مجبوراً بھابی اور بچوں کا سامان تیار کیا گیا۔

جانے سے پہلے بھیا گھڑی بھر کر کھڑے ہو گئے۔

"دہلی کے مکان میں نے اُن کے مہر میں دئیے" اُنھوں نے رکھائی سے طفیل سے کہا۔

"مہر؟" بھابی تھر تھر کانپنے لگی۔

"ہاں ــــ طلاق کے کاغذات وکیل کے ذریعہ پہنچ جائیں گے"

"مگر طلاق ــــ طلاق کا کیا ذکر ہے ــــ؟"

"اسی میں بہتری ہے"

"مگر ــــ بچے ــــ؟"

"یہ چاہیں تو انہیں لے جائیں ــــ ورنہ میں نے بورڈنگ میں انتظام کر لیا ہے۔"

ایک چیخ مار کر بھابی بھیا پر جھپٹیں ــــ مگر اُنھیں کھسوٹنے کی ہمت نہ پڑی۔ سہم کر ٹھٹک گئیں۔

اور پھر بھابی نے اپنی نسوانیت کی پوری طرح بے آبروئی کر ڈالی۔ وہ بھیا کے پیروں پر لوٹ گئیں۔ ناک رگڑ ڈالی۔

"تم اس سے شادی کر لو ــــ میں کچھ نہ کہوں گی۔ مگر خدا کے لئے مجھے طلاق نہ دو۔ میں یوں ہی زندگی گذار دوں گی۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی"

مگر بھیا نے نفرت سے بھابی کے تھل تھل کرتے ہوئے جسم کو دیکھا اور منہ موڑ لیا۔

"میں طلاق دے چکا۔ اب ــــ کیا ہوسکتا ہے۔"
مگر بھابی کو کون سمجھاتا۔ وہ بلبلاتے چلی گئیں۔
"بے وقوف ــ" طفیل نے ایک ہی جھٹکے میں بھابی کو زمین سے اٹھا لیا۔ "گدھی کہیں کی، چل اٹھ۔" اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔
کیا دردناک سماں تھا۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے میں بھابی کا ساتھ دے رہے تھے۔ اماں خاموش ایک ایک کا منہ تک رہی تھیں۔ ابا کی موت کے بعد ان کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ بھیا خود مختار تھے۔ بلکہ ہم سب کے سرپرست تھے۔ اماں انہیں بہت سمجھا کر ہار چکی تھیں۔ انہیں اس دن کی اچھی طرح خبر تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔
بھابھی چلی گئیں ــــ فضا ایسی خراب ہو گئی تھی کہ بھیاؔ اور شبنم بھی شادی کے بعد ہل اسٹیشن پر چلے گئے۔

سات آٹھ سال گزر گئے۔ کچھ کم و بیش ٹھیک اندازہ نہیں۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں کی ہوئیں۔ اماں کا انتقال ہو گیا۔ ابا کی موت کے بعد وہ بالکل گم سم ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بھابی کی طلاق پر بہت رونا پیٹنا مچایا۔ مگر بھیاؔ کے مزاج سے وہ واقف تھیں۔ وہ کبھی ابا کی بھی نہیں سنتے تھے۔ کماؤ پوت اپنا آپ مالک ہوتا ہے۔
آشیانہ اجڑ گیا۔ بھرا پرا گھر سنسان ہو گیا۔ سب ادھر ادھر اڑ گئے۔

سات آٹھ سال آنکھ جھپکتے نہ جانے کہاں گم تھے۔ کبھی سال دو سال میں بھیا کی کوئی خیر خبر مل جاتی۔ وہ زیادہ تر ہندوستان سے باہر ملکوں کی چک پھیریوں میں الجھے رہے۔ مگر جب ان کا خط آیا کہ وہ بمبئی آ رہے ہیں۔ تو بھولا بسرا بچپن پھر سے جاگ اٹھا۔ بھیاجی ٹرین سے اُترے تو ہم دونوں بچوں کیطرح لپٹ گئے۔ شبنم مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ ان کا سامان اتر رہا تھا جیسے ہی بھیا سے اس کی خیریت پوچھنے کو مڑی۔ دھپ سے ایک وزنی ہاتھ میری پیٹھ پر پڑا اور کئی من کا گرم گرم گوشت کا پہاڑ مجھ سے لپٹ گیا۔

"بھابی!" میں نے پلیٹ فارم سے نیچے گرنے سے بچنے کے لئے کھڑکی میں جھول کر کہا۔ زندگی میں میں نے شبنم کو کبھی بھابی نہ کہا تھا وہ لگتی بھی تو شبنم ہی تھی۔ مگر آج میرے منہ سے بے اختیار بھابی نکل گیا شبنم کی پھوار —— ان چند سالوں میں گوشت اور پوست کا تھودا کیسے بن گئی ؟ میں نے بھیا کی طرف دیکھا۔ وہ ویسے ہی دراز قد اور چھریرے تھے ایک تولہ گوشت اِدھر نہ اُدھر۔ وہی کم سن لڑکوں جیسے گھنے بال۔ بس دوچار سفید چاندی کے تار کنپٹیوں پر جھانکنے لگے تھے۔ جن سے وہ اور بھی حسین اور باوقار معلوم ہونے لگے تھے۔ ویسے کے ویسے چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر چٹان کی طرف لپکتی ہیں۔ اپنا سر اس کے قدموں میں دے مارتی ہیں —— پاش پاش ہو کر بکھر جاتی ہیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ ہار تھک کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ کچھ وہیں اسکے قدموں میں دم توڑ دیتی ہیں اور نئی لہریں پھر سرفروشی کے ارادے سمیٹے

چٹان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔
اور چٹان ——؟ ان سجدوں سے دور —— طنز سے مسکراتا رہتا ہے اٹل، لاپرواہ اور بے رحم! جب بھیا نے شبنم سے شادی کی تو سب ہی نے کہا تھا —— شبنم آزاد لڑکی ہے، پکی عمر کی ہے —— بھابی —— تو یہ میں نے شہناز کو ہمیشہ بھابی ہی کہا - ہاں تو شہناز بھولی اور کم سن تھی۔ — بھیا کے قابو میں آگئی —۔ یہ ناگن انہیں ڈس کر بے سدھ کر دے گی۔ انہیں مزہ چکھائے گی۔

مگر مزا تو لہروں کو صرف چٹان ہی سکھا سکتا ہے۔

"بچے بورڈنگ میں ہیں چھٹی نہیں تھی ان کی ——" شبنم نے کھٹی ڈکاروں بھری سانس میری گردن پر چھوڑ کر کہا۔

اور میں حیرت سے اس گوشت کے ڈھیر میں اس شبنم کی پھوار کو ڈھونڈھ رہی تھی۔ جس نے شہناز کے پیار کی آگ کو بجھا کر بھیا کے کلیجے میں نئی آگ بھڑکا دی تھی - مگر یہ کیا؟ بجائے اس آگ میں بھسم ہو کر راکھ ہو جانے کے بھیا تو اور بھی سونے کی طرح تپ کر نکھر آئے تھے۔ آگ خود اپنی تپش میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی - بھابی تو مکھن کا ڈھیر تھی —— مگر شبنم تو جھلسی ہوئی مٹیالی راکھ تھی —— اس کا سانولا کندنی رنگ مری ہوئی چھپکلی کے پیٹ کی طرح اور زرد ہو چکا تھا۔ وہ شربت گھلی ہوئی آنکھیں گدلی اور بے رونق ہو گئی تھیں۔ پتلی ناگن جیسی لچکتی ہوئی کمر کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ مستقل طور پر حاملہ معلوم

ہوتی تھی۔ وہ نازک نازک لچکیلی شاخوں جیسی باہیں مُگدر کی طرح گاؤ دم ہوگئی تھیں۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ پوڈر تھپا ہوا تھا۔ آنکھیں مسکارہ سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ بھنویں شاید غلطی سے زیادہ نچ گئی تھیں جبھی اتنی گہری پنسل گھسنا پڑی تھی۔

بھیّا رٹز میں ٹھہرے رات کو ڈنر پر ہم وہیں پہنچ گئے۔

کیبرے اپنے پورے عروج پر تھا۔ مصری حسینہ اپنی چھاتی جیسے پیٹ کو مروڑیاں دے رہی تھی۔ اس کے کولہے دائروں میں لچک رہے تھے ——— سڈول مرمریں بازو ہوا میں تھرتھرا رہے تھے ——— باریک شفان میں سے اس کی روپہلی ٹانگیں ہاتھی دانت کے تراشے ہوئے ستونوں کی طرح پھڑک رہی تھیں ——— بھیّا کی بھوکی آنکھیں اس کے جسم پر بچھوؤں کی طرح رینگ رہی تھیں ——— وہ بار بار اپنی گُدھی پر انجانی چوٹ سہلا رہے تھے۔

بھابھی ——— جو کبھی شبنم تھی ——— مصری رقاصہ کی طرح لہرائی ہوئی بجلی تھی۔ جو ایک دن بھیّا کے حواس پر گری تھی آج ریت کے تودے کی طرح بھسکی بیٹھی تھی اس کے موٹے موٹے گال خون کی کمی اور مستقل عارضی بدہضمی کی وجہ سے ممی کی طرح زردی مائل سبز ہو رہے تھے۔ نیان لائٹس کی روشنی میں اس کا رنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی انجانے ناگ نے اسے ڈس لیا ہو۔ مصری رقاصہ کے کولہے طوفان برپا کر رہے تھے اور بھیّا جی کے دل کی ناؤ اس بھنور میں چک پھیریاں کھا رہی تھی

پانچ بچوں کی ماں شبنم — جو اب بھابھی بن چکی تھی، سہمی سہمی نظروں سے انہیں تک رہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لئے وہ تیزی سے بھنا ہوا مرغ ہڑپ کر رہی تھیں۔

آرکسٹرا نے ایک بھرپور سانس کھینچی — ساز کراہے — ڈرم کا دل گونج اٹھا۔ مصری رقاصہ کی کمر نے آخری جھکولے لئے اور نڈھال ہو کر مرمریں فرش پر پھیل گئی —

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا — شبنم کی آنکھیں بھیّاجی کو ڈھونڈھ رہی تھیں — بیرا تر و تازہ راسبری اور کریم کا جگ لے آیا۔ بے خیالی میں شبنم نے پیالہ راسبریوں سے بھر لیا — اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھیں چوٹ کھائی ہوئی ہرنیوں کی طرح پریشان چوکڑیاں بھر رہی تھیں۔

بھیڑ بھاڑ سے دور — نیم تاریک بالکنی میں بھیّا کھڑے مصری رقاصہ کا سگریٹ سلگا رہے تھے۔ اُن کی پُر شوق نگاہیں رقاصہ کی نشیلی آنکھوں سے اُلجھ رہی تھیں۔ شبنم کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ ایک بے ہنگم پہاڑ کی طرح گم سم بیٹھی تھی۔ شبنم کو اپنی طرف تکتا دیکھ کر بھیّا رقاصہ کا بازو تھامے اپنی میز کی طرف لوٹ آئے۔ اور ہمارا تعارف کرایا۔

"میری بہن" انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ رقاصہ نے لچک کر میرے وجود کو مان لیا۔

"میری بیگم" انہوں نے ڈرامائی انداز میں کہا . . . . . جیسے کوئی

میدانِ جنگ میں کھایا ہوا زخم کسی کو دکھا رہا ہو۔ رقاصہ دم بخود رہ گئی۔ جیسے اس نے ان کی رفیقۂ حیات کو نہیں خود ان لاش کو خون میں غلطاں دیکھ لیا ہو۔ وہ ہیبت زدہ ہو کر شبنم کو گھورنے لگی پھر اس نے اپنے کلیجے کی ساری ممتا اپنی آنکھوں میں سمو کر بھیا کی طرف دیکھا۔ اس کی ایک نظر میں لاکھوں افسانے پوشیدہ تھے۔ "اُف یہ ہندوستان جہاں جہالت سے کیسی کیسی پیاری ہستیاں رسم و رواج پر قربان کی جاتی ہیں۔ قابلِ پرستش ہیں وہ لوگ اور قابلِ رحم بھی جو ایسی ایسی سزائیں بھگتتے ہیں۔"

شبنم میری بھابی نے رقاصہ کی نگاہوں میں یہ سب کچھ پڑھ لیا اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ پریشانی چھپانے کے لئے اس نے کریم کا جگ اٹھا کر سٹبھریوں پر انڈیل دیا اور جٹ گئی۔

بیچارے بھیا جی! ہینڈسم اور مظلوم —— سورج دیوتا کی طرح حسین اور روشنک شہد بھری آنکھوں والے بھیا جی چٹان کی طرح اٹل — ایک امر شہید کا روپ سجائے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ایک لہر چور چور ان کے قدموں میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔

دوسری نئی نویلی چلکتی ہوئی لہر ان کی پتھریلی باہنوں میں سمانے کے لئے بے چین اور بے قرار تھی!

عشق پہ زور نہیں

"اے آپا، کچھ سنا ؟" وہاب چچا کی دلہن کی ناک کے غدود پھول گئے تھے۔ میں نے ان کی ناک سے خون نکلتے نہیں سُنا۔ وہ بھد بھد کرتی بڑے ابا والی ڈیوڑھی سے گزریں۔ ان کی گود میں ان کا دسواں بارھواں اسقاط تھا۔ ننھے بھائی اُن کے ہر بچے کو اسقاط کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ جوں ہی ان کا پیر بھاری ہوتا وہ اسقاط کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتیں، دور دور کے محلوں کی دائیاں اور مہترانیاں ہار جاتیں اور ملوا ہیاؤں ہیاؤں آ ہی جاتا۔ مشکل سے ساڑھے تین فٹ کا قد ہو گا۔ مگر قطر بھی اتنا ہی ہو گا ...... بس گول، جیسے ہوا بھری فٹ بال، پیٹ خالی ہوتا جو کہ بہت ہی تھوڑے وقفے کے لئے ہوا کرتا تھا۔ تب بھی وہی حالت رہتی۔ انچ دو انچ کا فرق تو وہ جب ڈٹ کر جب

کے کونڈے کھاتی تھیں۔ جب بھی ہو جاتا تھا۔ سلیپر کھلتی وہ دھپ سے آکر بیوی کے پلنگ پر بیٹھ گئیں بیوی اور ان کی پٹاری چھنک اٹھے۔ ہم اپنی اماں کو نوکروں کی دیکھا دیکھی بیوی ہی کہتے تھے
"اے ہے موت آئے، گوڑے نے بوت دیا" وہ لونڈے کو پائینتی پر لٹکا کر "شی شی" کرنے لگتیں۔ بیوی جل گئیں "کمبخت نے موت دیا تو اس میں کو سننے کی کون سی بات ہے۔؟"
"اے ڈپٹی میں تو اس کا ذکر کر رہی تھی آپا، خلیفہ ڈڈے نکاح کر لیا۔
"اوئی ۔۔۔۔ خلیفن نے نکاح کر لیا ۔۔۔۔ کب؟ ۔۔۔ کس سے
بیوی ناک پر سروتا رکھ کر چونکیں۔
"پچھلی جمیرات کو ۔۔۔۔۔ محمد میاں سے"
"اے خدائی خوار کو یہ بڑھاپے میں کیا چونچلے بگھارنے کی سوجھی"
"اللہ جاڈے" وہاب چچا کی دلہن نے گریبان کھول کر لونڈے کا دستر خوان لگا دیا۔ اللہ کیا بدن تھا۔ ہم لونڈیاں بالیاں تو شرم سے پانی پانی ہو جایا کرتی تھیں۔ بچوں کے ناشتہ دان بھتے کر مراد آبادی لوٹے۔ پچھلا اسقاط تو اسی لوٹے کے نیچے دب کر جاں بحق تسلیم ہوگیا۔ رات کو سوتے میں منہ میں دودھ دیا۔ نہ جانے کیسے نیند میں کروٹ لی کہ منہ اور ناک پر ڈھائی تین سیر گوشت آن پڑا۔ بیچارے کا دم گھٹ گیا مر گیا۔ ان کا جسم دیکھ کر مجھے خیال آیا کرتا تھا شاعروں کو عورت کے اس حصہ جسم سے بڑا عشق ہے۔ دیکھ لیں ایک دفعہ

دہاب چچا کی دُلہن کو تو جی بھر جائے۔

خلیفن پینتالیس سال کے پیٹے میں ہونگی۔ خلیفہ کو مرے چار پانچ سال ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں شریف عورت اس عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہے اور کسی سے دل لگانے کی بجائے خدا سے لَو لگاتی ہے کوئی نگوڑی ناہٹی نہ تھیں دو بیٹے، دو بیٹیاں چھوٹی بیٹی بکّو میرے سامنے دھن کوٹ کے مدرسے میں روز تختیوں سے پیٹی جاتی تھی باقری کا رحمٰن بھائی کے لونڈے انو سے بڑے دھماکے کا عشق چل رہا تھا۔ کیوں کہ ڈلّا کا کردار خاکسار ہی ادا کرتی تھی۔

خلیفن کا سن نکاح کا نہ تھا پھر حمد میاں ان سے دو سال چھوٹے ہی ہوں گے۔ بیوی ڈیڑھ سال ہوا چار بچے چھوڑ کر مرگئی تھی نگوڑے ناٹھے رہ گئے تھے۔ کیا دیو ہیکل انسان تھے! یہ لمبا قد، چوڑی چھاتی، بیچک رو، سیاہ بھجنگے لکڑی کا دھندا کرتے تھے۔ چھتے پر ان کی ٹال تھی۔ خود ماٹھان میں رہتے تھے۔ کبھی لکڑیوں کی ضرورت ہوتی خود چھکڑا لے کر آتے تو ڈیوڑھی پر ضرور آتے۔

"آپا بچھو . . . . . پان دان نہیں دوگی" وہ زور سے ڈنکارتے محلوں ٹولیوں میں رشتے داری ہوتے ہیں۔ اماں جنہیں حمد میاں کی ہاتھی جیسی چنگھاڑ سے دل کا دورہ پڑنے لگتا تھا۔ جلدی سے پان لگا پاندان کے ڈھکنے پر رکھ کر بھجوا دیتیں، حمد بھائی خاصدان میں پان لگ کر جانے والی حیثیت کے آدمی نہیں تھے۔ ان کی بیوی جب زندہ

تھیں، آتیں تو پلنگ کی ادوائن پر ہی بیٹھتیں۔ وہاب چچا کی دلہن دھپ سے ہر جگہ بیٹھنے کا حق رکھتی تھیں۔

علیم الدین، کلیم الدین دو بیٹے ریلوے میں گڈس کلرک تھے بڑی بیٹی زینب ہمارے ہی محلے میں یعنی پنجہ شاہی پر رہتی تھیں ان کے میاں کندے کا کام کرتے تھے۔ چھوٹی کا میاں فیض آباد میں تھانے دار تھا۔ وہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ خلیفہ نے انہیں کسی کا محتاج نہیں چھوڑا تھا۔ اپنا مکان تھا۔ دو کوٹھڑیاں اور کھپریل۔ گھر بیٹھے بٹھائے نیک بخت کو کیا مار پڑی کہ جوان جہان بیٹوں بیٹیوں کا منہ کالا کرایا۔

زینب خالہ نے تو رو رو کر آنکھیں سجالیں ان کی نندوں نے اتنے طعنے دیئے کہ کلیجا چھلنی کر دیا۔ انہوں نے جل کر پھندن کی منگنی اپنی بڑی نند کی لونڈیا سے توڑ دی۔ پھندن نے اپنی پھوپھی زاد بہن سے بچپن سے منگا ہوا تھا۔

"پھندن کی منگنی ٹوٹ گئی . . . . . پھندن کی دلہن روٹھ گئی . . .
. . . پھندن کی ساس نے منگنی توڑ دی" گلی کے لونڈوں نے وہ نگوڑے کے پیچھے تالی دی کہ اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ دن بھر کنکیاں لوٹا کرتا تھا۔ چھ برس کا پھندن مجنوں بن گیا۔

ڈھیلی ڈھالی خلیفن سے کسی کو امید نہ تھی کہ یوں بڑھاپے میں خصم کریں گی۔ موا سارا چونڈا بھسک ہوتا جا رہا تھا۔ ہاں بتیسی

سلامت تھی۔ سفید براق کپڑے پہن کر کبھی تیج تیوہار پر حصے کی رکابی تھامے ہمارے ہاں آتی تھیں۔ اکیلی اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ بڑی محبت کی آدمی تھیں۔ بات بے بات بچوں کو گھر میں بھرے رہتی تھیں کبھی سنگھاڑے بانٹ رہی ہیں۔ کبھی بیر۔ کبھی کچھ نہیں تو میٹھی میٹھی چنے ہی بانٹ دیتیں۔ باری باری سب بیٹوں بیٹیوں کے ہاں جا کر رہیں۔ مگر کسی کو ان کی ضرورت نہ تھی۔ ویسے زبان کی ہمیشہ سے کڑوی تھیں پر خلیفہ کی موت نے تو زبان کی نوک میں زہر بھر دیا جہاں جاتیں سبھی کا کانٹا بن جاتیں۔ میاں بیوی میں طلاقم طلاقا پر نوبت پہنچ جاتی ویسے زینب آپا کی سسرال میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ خلیفن بھی رہ سکتیں۔ کلیم الدین کی بیوی سے اس لئے نہ بنی کہ وہ ٹھہریں فیشن ایبل۔ ان کی بچیاں گچھے سے بالوں میں ربن ڈالتیں۔ خلیفن کو ہول اٹھتی وہ تیل چپڑ کر پنڈیاں باندھ دیتیں۔ بہو نے صاف کہہ دیا ”یا تو اماں رہیں یا میں“ ظاہر ہے کہ اماں کو بوریا بستر اٹھا کر اپنے گھر لوٹنا پڑا۔ فیض آباد والی کے ہاں جی نہ لگا۔ گھر نوکروں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ذرا ذرا سی بات پا پچھریاں پکڑتیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتیں۔ لازم تو یہ کہ مزے سے دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ اللہ کی یاد میں وقت گذارتیں۔ مگر نہیں خلیفن کو تو چل تھی۔ نچلا بیٹھنا دشوار تھا۔ کھسر پھسر سارے گھر میں گھستی پھرتیں ادھر کی چیز بن ادھر ہر جگہ گھر میں تالے، نوکروں نے ان کے خلاف محاذ بنالیا۔ زندگی دشوار ہو گئی ویسے میاں بیوی کو اپنی باتوں سے

کب فرصت ملتی تھی جو ان سے دو باتیں کر لیتے۔ نہ گھر میں بچہ تھا کہ ان کا جی بہلتا۔ چھوٹے نے صاف انکار کر دیا "وہ یہاں آپ کو قباحت ہو گی۔ میں خرچہ تو بھیج رہا ہوں پابندی سے" خرچے کی خلیفن کو کمی نہ تھی۔ صرف خرچہ ہی زندگی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ انھیں سجی ہوئی مورتی کی طرح بیٹھنے کی عادت نہ تھی اچھے خاصے گھر میں کون تھا اب کوڑا کرنے والا پھر بھی جھاڑو دیتیں خلیفہ زندہ تھے تب اتنی تنہائی نہ تھی کتنے کام تھے۔ کیسا بھرا بھرا گھر لگتا ہے۔ ایک دم کی کتنی رونق تھی چھوٹے کی جب تک شادی نہ ہوئی تھی۔ زینب بھی باپ کی لاڈلی تھی۔ کیا مجال جو روز نہ آئے۔ اب مہینے گذر جاتے تھے۔ اسے اپنے بال بچوں سے ہی فرصت نہ تھی کبھی وہ دن تھے خلیفن کو نواسوں، پوتوں کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ خلیفہ ہی ان کی گود کا بچہ تھے۔ کئی سال سے چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔ ان کے گھٹنوں پر مالش کرتیں۔ حقہ دم دم بھر کر دیتیں پچیس سال کا ساتھ تھا۔ خلیفہ ان کے جسم کا حصہ بن چکے تھے ان کے پیار میں کتنا انہماک تھا کہ عبادت کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ ایک پل کو اوجھل ہو جاتیں تو خلیفہ بچوں کی طرح مچل اٹھتے۔ مرتے مرگئے کبھی پٹی سے بیوی کی پلنگڑی ہی جدا نہ کی۔

رات کو خلیفہ ان سے فلرٹ کرتے تو وہ نئی نویلی دلہن کی طرح ٹنک کر کہتیں،"

"اے ہٹو، بڑھاپے میں یہ چوچلے نہیں بھاتے۔"

"ہوں کیا سمجھتی ہو، میں اپاہج ہوں تو مرد بھی نہیں رہا" وہ کروٹ لے کر ان کے پلنگ پر آرہتے۔ اسی لئے تو انگنی پہ ہمیشہ جازم تان دیا کرتی تھیں۔ جب بڑی بہو بیاہ کر آئیں تو انہیں اپنی جازم کے باندھنے پہ بڑی شرم آئی "ہے ہے جوان بیٹا کیا سوچے گا۔ بہو کیا کرے گی"

بہو مسکرائی "اے ہمارے اماں ابا تو جازمیں نہیں تانتے۔ یہ تو ابھی تک دلہن دلہا بنے ہوئے ہیں" اس نے کئی بار کہا۔

"بکو مت" بیٹے نے ڈانٹا اور کروٹ لے کر روٹھ گیا اس نے آنکھیں کھول کر یہ جازم یوں ہی تنی دیکھی تھی اس کے دل میں اس کا احترام تھا اس کا اپنا وجود بھی اس جازم کا مرہون منت تھا اور پھر آخری دنوں میں جب خلیفہ کا چل چلاؤ تھا، تب بھی ان کا ہاتھ خلیفن کے سینے پر نہ ہوتا تو انہیں نیند نہ آتی۔ کتنا تشکر تھا۔ ان کے ہاتھ کے لمس میں! اور اب نہ انگنی تھی اور نہ ہی جازم کے باہر پڑے ہوئے جوان بیٹوں اور بیٹیوں کے کھٹولے۔ چڑیاں دانا چگ کر اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چکی تھیں نئی دنیائیں بسائیں تھیں۔ مگر خلیفن کا پنجرا سنسان پڑا تھا۔ کبوتر کو یم دوت اٹھا کر لے گئے تھے۔ کبوتری تنہا پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل پر کسی کا سہارا نہ تھا۔

خلیفن نے کھچڑی کی پتیلی بھوبل پر سے گھسیٹ کر پاس کر لی اب

کون بیٹی میں کھا سجا کر ایک اپنی جان کے لئے لے جائے۔ چٹنی بھی نہیں پیسی۔ بڑے کو بڑی بھاتی تھی۔ گھی کی لسی طاق پر تھی۔ مگر انہیں ہاتھ بڑھا کر اتارنے کی توفیق نہ ہوئی۔ تیسرا روزہ تھا افطاری انہوں نے سب کی سب مسجد میں بھجوا دی تھی۔ دور دور کوئی اپنا نہ تھا۔ زینب اپنی سسرال گئی ہوئی تھی۔ کتنا کہا کھلے جا رہی ہے۔ بچی کی پڑھائی کا ہرج ہوگا اسے میرے پاس چھوڑ جا۔ مگر کون چھوڑتا ہے اپنی اولاد کو۔ انسان کس طرح کلیجا پھاڑ کر پیدا کرتا ہے۔ اور پھر خالی ہاتھ رہ جاتا ہے دودھ چھٹا کر جب بچے کو روٹی چاول پر لگا دو تو پھر وہ ماں سے ایسے نہیں چمٹتا، اولاد بیاہ دو تو اس کے اپنے بال بچے اس کی ساری محبت سارا پیار لے لیتے ہیں۔ بوڑھے کھونٹ ماں باپ کے لئے کیا بچتا ہے! صحن میں مینہ کی جھڑی لگی تھی۔ مگر غلیغن کی آنکھیں، خشک تھیں۔

انہوں نے کھچڑی کی پتیلی چھینکے پر جوں کی توں اٹھا کر رکھی دی لوٹے سے ہاتھ دو ڈالے۔ ایک رکابی وہ بھی چکنائی کی۔ دھونے میں کون سے ہل بیل لگتے ہیں۔ ہائے اسی باورچی خانہ میں کبھی برتنوں کا ڈھیر ہوا کرتا تھا۔ تین چار پتیلیاں چھوٹی بڑی، آٹھ دس پلیٹیں، چمچے کفگیر، تھالیاں، سینیاں مانجھتے مانجھتے کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ کیا پتہ تھا ایک دن — ایک ہی پلیٹ رہ جائے گی، وہ بھی سوکھی!

دروازے پر زنجیر کھڑکی — وہ کون ہو سکتا ہے؟ — الٰہی خیر...

۔۔۔ کہیں تار نہ ہو۔ اولاد اللہ نے دے دی بھیجدی تو پھر ماتا کی رگ بھی مسل دی ہوتی، تیری بڑی قدرت ہے پروردگار۔"

"کون ہے؟ انہوں نے پلیٹ طاق میں رکھ کر پکارا

"دروازہ تو کھولو ۔۔۔۔۔ میں ہوں ممدّ ۔۔۔ کلّو کی ماں"

"ارے یہ رات کے وقت!" انہوں نے سر پہ بورا ڈال کر دروازہ کھولا اور آڑ میں ہو گئیں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے ۔۔۔۔ ممدّ نے دہلیز کے نیچے سر چھپاتے ہوئے مینہہ سے بچنا چاہا۔

"اے مردوئے، کھڑا پانی میں بھیگ رہا ہے منہ سے نہیں پھوٹتا۔ کیا بات ہے؟"

"وہ ۔۔۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔۔ کوئی دائی کا پتہ مل جاتا تو ۔۔۔۔"

"اوہو ۔۔۔۔ تو یہ بات ہے! چپ چپاتے بیاہ بھی رچالیا اور ہمیں پتہ نہیں۔"

"یہ بات نہیں کلو کی ماں" دیوزاد ممد میاں نے بھیگی ہوئی مردہ آواز میں کہا،

"اے بھائی یہ رات کے گیارہ بجے پانی آندھی میں پہیلیاں بجھوانے آئے ہو یہ کیا مذاق ہے؟"

"اب ۔۔۔۔ اب تم سے کیا کہوں ۔۔۔ یہ ۔۔۔۔ بنّو ۔۔۔"

"بنّو! ۔۔۔۔ اری کون بنّو؟"

"میری لونڈیا۔"

"اچھا . . . اچھا بنو . . . اوئی بنو نگوڑی . . . . . . اے مردوئے تیرا چپیتا پگھل گیا ہے کیا؟ . . . ہے ہے یہ سب باسط کے لونڈے کے کرتوت ہیں"

دائی کا پتہ بتاتی ہو کر . . . . . . میں جاؤں . . . لونڈیا کا اننتے میں دم نکل چکا ہوگا" محمد میاں بولے۔

"ہے ہے . . . . اب اس وقت دائی کا پتہ کہاں سے بتاؤں . . . . میتن کو یاد گوے کا درد اٹھا ہے"

"اسی کے ہاں سے آرہا ہوں"

"تم کہاں رہو ہو؟"

"مائی تھان . . . . مگر میں . . . . میں نہیں چاہتا اللہ دی بڑی حرامزادی ہے سارے محلے میں پھونک دے گی ویسے ہی رہنا دوبھر ہو رہا ہے . . . . اب اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جا کر حرامزادی کا گلا گھونٹ دوں گا" محمد میاں جلدی سے مڑ پڑے۔

"اے میاں ٹھہرو! یہ بھی کوئی طریقہ ہے . . . . تم کہو تو میں چلی چلوں اور کیا . . . . ."

"تم؟"

"ہاں، ایک سے دو اچھے ہوتے ہیں . . . اور تم ٹھہرے مرد آدمی . . . . کوئی سواری؟"

"اِکہ ہے چھیدو کا . . . . ."

برقعہ سر پہ ڈال کر خلیفن نے چٹ لالٹین بجھا، ممد میاں کو تالا پکڑا دیا اور لپک جھپک دوڑیں اکہ" کی طرف تالہ لگا کر ممد میاں بھی لپکے جلدی سے خلیفن کو سہارا دے کر خود اکہ" ہانکنے لگے۔

" اور چھیدو موا کہاں ہے ؟"

" پیے ہوئے پڑا تھا۔ بہت سر مارا۔ پھر میں اکہ" لے کر چلا گیا سالے کو کرایہ بھی نہیں دوں گا۔"

اندھیری کوٹھڑی میں کالی بھجنگ چٹخی ہوئی چمنی کی لالٹین بھڑک رہی تھی اور کھٹولے پر تیرہ چودہ برس کی تنکا سی لڑکی سسکیاں بھر رہی تھی۔

" نئی میری لاڈو۔ نہیں"۔ خلیفن کا جی بھر آیا۔ انہوں نے بچّی کا منہ اپنے ڈوپٹے کے کونے سے پوچھا۔ پھر اپنے آنسو ضبط کر کے ممدّ میاں پر چلائیں۔

" کیا میری چھاتی پر کھڑے ہو کاٹھ کے اُلّو کی طرح۔ کوئی صاف ستھری چادر تو دو۔"

صاف ستھری چادر کا اس گندے سنڈاس گھر میں کیا ذکر۔ ممدّ میاں نے اپنی دُھلی ہوئی تہمد نکال کر دی۔ وہ ایک قمیص بنیائن بھی خلیفن نے لے لیئے۔ پھر کواڑ بھیڑ کر انہوں نے برقعہ ایک طرف ڈالا اور آستین چڑھا کر بچی پر جٹ گئیں۔ گودڑ گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دی۔ دری موڑ کر آدھی اس کے نیچے بچھائی۔ پلنگڑی کو

گھسیٹ کر سیدھا کیا۔

"اے کوئی دوسری لالٹین نہیں؟"

"ہوگی کہیں کوٹھڑی میں۔"

"بھوبل ڈالو تم اسی کو صاف کرو۔ اِتنے کوئی موم بتی دے دو۔"

ممدّو میاں نے نیل کی کپّی پکڑا دی۔ انہیں ہوش ہی نہ تھا کہ برقعہ نہیں ہے۔ ممدو میاں کی آنکھیں نیچی رہیں۔ برآمدے میں ایک پانچ چھ برس کی لڑکی اور دو ننھے سے چھوٹے لڑکے سہمے ہوئے ٹکر ٹکر تک رہے تھے۔

"ان بچوں کو تو سُلا دو۔"

"نہیں سوتے حرامزادے۔"

"حرامزادے تو تم ہو ممدّو میاں جو لونڈیا کی یہ درگت بنوالی اور آنکھوں کی چربی نہ پگھلی۔"

مارے غصے کے ممدو میاں کا منہ لال پڑ گیا۔ ایک دم بھنّا کر بولے "چولھے میں جاؤ...... غارت ہو........ جو ہوگا سو میں خود دیکھ لوں گا۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔"

"گھاس کھا گیا ہے مردوے تو جنائے گا؟" خلیفن غرائیں۔

"تیری ایسی کی تیسی مردار...... چل نکل یہاں سے......" ممدّو میاں گرجے۔

مارے غصے کے اُن کے آنسو بہنے لگے اور سارا جسم تھر تھر

کانپنے لگا۔

"چل دُور ہو موئے ...." انہوں نے دھڑ سے دروازے بند کر لئے اور ممد میاں سر پکڑ کر ہچکیوں سے روتے دیں بیٹھ گئے۔ بچے بھی رونے لگے۔

کپی کی روشنی میں آنکھوں نے دیکھا۔ بچی کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ دانتی بھچ گئی اور ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔

"ہائے میری بچی ......" وہ دھاروں دھار روتی ہوئی اسے سنبھالنے لگی۔ ان کی چیخ سنکر ممد میاں نے دروازہ کوٹ ڈالا.... بنو، سخت جان عورت کی ذات دردے کر پھر سنبھل گئی اور انہوں نے ممد میاں کی سات پشتیں توم ڈالیں۔ باسط خاں کے پرکھوں کی قبریں کھود کر ان کے سروں پر سے کفن گھسیٹ لئے۔ مائی تھان اور مائی تھان کے رہنے والوں حتیٰ کہ اگرے کے باسیوں تک کو نہ چھوڑا وہ روتی جاتی تھیں۔ سوکھی ماری ٹڈا سی لونڈیا دوہری ہو گئی۔

"نہ رو چندا ...... بس ...... ہاں ذرا پیٹ پکڑ لے میری بٹیا.. .... ہاں میری لاڈو .... اوپر سانس نہیں کھینچ .... ہاں ...... بس نیچے ہی نیچے ...... ان کے ہوتوں سوتوں کی میت جائے ...... دم گھونٹ کے ...... ہاں ...... ہاں ...... ہا...... آ..... آن ....."

بچے میں دم نہ تھا جیسے جھینگڑے کا گڑا۔ خلیفن نے لوٹا پوٹا...

پیروں سے جھلایا۔ دو چار تھپکیاں دیں۔

"چیں.... "نئی زندگی پکاری اور مارے خوشی کے خلیفن کے دو گنے آنسو بہنے لگے۔

"بیٹا ہے ماشاءاللہ......" دھڑ سے انہوں نے دروازہ کھول کر اعلان کیا۔ ان کا منہ ہاتھ اور کپڑے خون میں لت پت تھے۔ ڈوپٹہ غائب...... گوشت کی لال بوٹی کی طرف انہوں نے پیار سے دیکھا، اور ممدّ میاں کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کواڑ بھیڑ دیئے۔ ممدّ میاں کی مسکراہٹ ایک دم کے لئے پنکی اور پھر بجھ گئی۔ خلیفن بھی کھسیانی رہ گئیں۔ مبارکباد کا بھلا کیا موقع تھا۔

"ایک پیالہ دودھ ہوگا" انہوں نے بچے کو نہلانے کے بجائے اپنے برقعے سے پونچھ کر ممد میاں کی قمیص میں لپیٹ کر منو سے چھوٹے بھائی کو پکڑا دیا۔ بچے چاروں طرف بیٹھ کر حیرت سے اس کپڑے کو دیکھنے لگے جو ان کی چھوٹی آپو کے پیٹ سے نکلا تھا۔

بچوں کو سلا کر ممد میاں کی قمیض پہن کر انہوں نے ایک دھلی ہوئی تہمد کا ڈوپٹہ بنا کر اوڑھ لیا۔ پیجامہ کا کیا ہے گھر جا کر بدل لیں گی۔ لیکن باورچی خانہ تھا جیسے کتے کی کنڈیلی۔ نہ جانے کب سے ہانڈیاں پڑی سڑ رہی تھیں۔ ممدّ میاں کے بہو کے سارے جہیز کے برتن لتھڑے پڑے تھے واپسی سحری کے وقت سے پہلے نہ ہو سکی۔ راستے میں ممد میاں نے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگی۔ غلطی کچھ خلیفن کی بھی کم نہ تھی۔ ایسے

موقعے پر خلیفہ ہونے تو لگا نے، دو جوتیاں پکڑ کے۔ بڑا تیہا تھا مرنے والے کا۔

مگر اتا" پھر بھی کہوں گی ممدؔ میاں تمہاری کمزوری ہے"۔

"کیا کروں کلو کی ماں؟ ..... لونڈیا کا باپ ہوتا بھی قیامت ہے"

"مرد ہو کے مجھ سے پوچھتے ہو؟ ...... وہ کوئی لاٹ کا بچہ ہی ہووے۔ میں تو چھاتی پہ چڑھ کے لہو پی جاتی۔"

اور سچ مچ خلیفن نے خون پی لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب بنو میں ذرا دم آ گیا۔ تو ایک دن وہ اپنی زرہ بکتر یعنی تازہ دھلا بُرقعہ نکال کر پہنچیں۔ ممد میاں کے ہاں انہوں نے واجد میاں طو لعمرہٗ یعنی بنو کے لونڈے کو تیل مل کر نہلایا۔ یہ ڈھیر سا کاجل بڑی بڑی آنکھوں میں بھرا۔ نظر گذر سے بچانے کو ایک ٹیکا دائیں پیر کے تلوے اور دائیں گال پر لگایا۔ سُرخ گرنٹ کا کُرتہ جس میں پیلی مغزی لگی تھی پہنا کر اودا ہری جھالر کا کنٹوپ پہنایا۔ موزے انہوں نے بساطی کی دوکان پر جاتے جاتے خرید لئے تھے۔ بنو کو انہوں نے گلابی غرارہ کرتا اور فیروزی چنا ہوا دوپٹہ اڑاھا۔ نگوڑی ابھی تھی کتنی جو برقعہ اوڑھتی۔ انہوں نے لمبی سی چادر سر سے پیر تک لپیٹ دی۔ جو اس کی موتیوں کی گرگابی تک پہنچ رہی تھی ـــ!

اور یوں قافلہ چلا۔ آگے آگے فیلڈ مارشل یعنی خلیفن برقعے کا نقاب منہ پر منڈھے ان کی گھونٹا سی ناک کنارہ بنی، گود میں واجد علی خاں ولد واحد علی خاں

ولد باسط علی خان سپرنٹنڈنٹ پولیس ساکن مائی ہقان۔ پیچھے ان کے واجد علی خان کی مختصرسی والدہ ماجدہ اور ان کے پیچھے محلے کے لونڈوں اور لینڈی کتوں کی فوج۔ خلیفن نے حویلی پر چڑھائی کردی۔

دربان "نا نا" کرتا ہی رہا۔ اور وہ ایک چھپاکے کے ساتھ... غڑاپ سے بنو کا ہاتھ پکڑ کر اندر۔ دربان کتوں اور گلی کے بچوں سے ہی جوجھتا رہ گیا۔ اندر سپرڈنٹنی برآمدے میں تخت پر بیٹھی تازہ اخبار "تہذیب نسواں" کا مطالعہ کر رہی تھی۔ صاف ستھری چوکیوں پہ سفید چٹی چاندنی کسی تھی۔ جس پہ گاؤ تکیہ اور گاؤ تکیے کی ہم شکل بیگم سجی ہوئی گوبھی کی کھیر کی ترکیب پر غور کر رہی تھی۔ لشکر دیکھ کر ان کی چٹی بھنویں کنکھجورہ بن گئیں۔

دندناتی آ تو گئیں خلیفن، پہ ایک دم جی پر پولیس کی بیگم کی دہشت بیٹھ گئی۔ نقاب الٹ کر ہکلائیں۔ "سلام.... بیگم صاحب.... اری بنو، ساس کو سلام کر نگوڑی۔" انھوں نے سنبھل کر حکم دیا۔

سوکھا مارا زرد ہاتھ ماتھے پر لگا کر بنو دوہری ہو گئی۔ چادر کے گھونگھٹ میں اس کے لرزتے ہوئے آنسو جذب ہوتے رہے۔

"کیا ہے خلیفن؟" بیگم نے ترشی سے کہا۔ انہوں نے ان سے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ تکیئے سے لگی، عینک اتار کر گھورنے لگیں۔ مگر خلیفن قلعے کے اندر پہنچ کر شل ہو گئی تھیں۔ دھم سے بیٹھ گئیں۔

"اے بیگم پوتا مبارک ہو۔" انہوں نے رنگ برنگی پوٹلی بیگم کی گود میں دھر دی۔ بیگم ایسی بدکیں جیسے کسی نے دہکتا ہوا انگارہ گود میں ڈال

دیا ہو۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" انھوں نے جلدی سے پوٹلی اپنی گود سے الگ رکھ دی۔

"نکل جاؤ کمبختو...... سپرنٹنڈنٹ صاحب گھر پہ نہیں ورنہ کھانے پہنچا دیتے۔"

"اے بیگم!...... کیسا پتھر کا کلیجہ ہے تمہارا۔" انہوں نے بچے کو چھاتی سے لگا کر کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟..... بھاگ جاؤ تم لوگ... ایے اومسیتا! ذرا تو دیکھ میاں پنڈت جی کی طرف ہوں گے۔ لپک کر بلا تو لا....."

"ہاں ہاں بلوا لو دادا جان کو بھی، پوتے کو دیکھ کر کلیجا ٹھنڈا ہو جانے گا۔"

"بس بس۔ زیادہ جبڑا نہ ہلاؤ خلیفن لوا... یہ بلا اٹھاؤ اور باہر نکلو"

"اے ہے، اس ننھی سی جان کو بلا کہہ رہی ہو، ذرا دیکھو تو بیگم۔ بالکل کھلونا ہے۔"

"اے تو ہم کیا کریں....."

"اے کلیجے سے لگاؤ اور کیا کرو..... اللہ نے یہ دن دکھایا۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ بیگم صاحب اتنی ننھی نہ بنو، غریب کی لونڈیا مٹی کی گڑیا نہیں کہ چار دن کھیل کے ٹھکرا دیا۔ بانٹ پکڑا ہے تو صاجزادے کو نبھانا ہو گا۔"

"مگر خلیفن!..... واحد میاں نے تو ابھی میٹرک بھی نہیں کیا.... اللہ رکھے بی اے کریں گے.... ولائیت جائیں گے تب شادی وادی بھی ہو!

جائے گی۔"

جب تک سرکار نہ آئیں۔ بیگم نے سوچا ذرا نرمی سے بات ہو جائے۔

"ہاں ہاں بیگم میں یہ کب کہتی ہوں کہ میاں پڑھنا چھوڑ دیں۔....."

اور پھر میں تو اپنی نند کو زبان دے چکی ہوں" انھوں نے دبی زبان سے کہا۔

"نند کو زبان دے چکی تھیں۔ بیگم تو لونڈے کو گلے میں رسی ڈال کے رکھا ہوتا کہ بے تھا ہیل دوسروں کی کھیتیاں نہ کچلتا پھرے۔ نابیوی، وہ زمانے لد گئے"۔ غلیبن پھر گرم ہوئیں۔ ایک دم جو برس پڑیں۔"اری نامراد، کیا ٹسوے بہا رہی ہے۔ اٹھ کے ساس کے پیر پکڑ لے" اور یہ تو جیسے منتظر ہی تھی گرنے کی۔ تیورا کر بیگم کے قدموں پر گر گئی۔ ننھے ننھے سوکھے مارے ہاتھوں سے موٹے چکنے پیر پکڑ کر ان پر ماتھا ٹکا دیا۔

بیگم کے جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ جھٹکا دیا تو بنو دھپ کر سلفچی پر گری۔

"اے ہے جروا، تیرا دل ہے کہ موا پتھر، جو لونڈیا کے جگہ بے جگہ چوٹ لگ جاتی تو؟"

"اری خیرن...... باقر...... اللہ دی۔ ذرا لینا اس حرامزادی کو نکالو تو اسے جوتیاں مار کے....."

"جوتیوں کی بچی! حرامزادی تو اور تیری سات پشتیں۔ بڑی لاٹ صاحب

کی بچی آئی کہیں کی ۔ چونڈا اکھٹر کے اتنی جوتیاں لگاؤں گی کہ باوا کا نام بھول جائے ...... ‘‘ شیرنی کی طرح خلیفن گرجیں ۔ ہنو اور اس کا بچہ چلا چلا کر رونے لگے ۔

’’ ارے یہ کیا قصہ ہے ...... ؟ ‘‘ سپرنٹنڈنٹ صاحب گرجے ۔ یہ ڈیل ڈول ، یہ بڑی بڑی مہندی میں رچی ہوئی مونچھیں ۔ گول انڈا سی توند ، چست پاجامہ اور باریک لکھنؤ کی چکن کا کرتا پہنے ، شکاری ہیٹ گرمی سے بچنے کو لگا لیا تھا ۔ عجیب تو پچھوں کی سی شکل کے لگ رہے تھے کبھی بڑے حسین ہوں گے ۔ اب تو پھٹکار برسنے لگی تھی ۔

’’ سلام میاں ...... ‘‘ خلیفن بھر لچک گئیں ۔

’’ سلام خلیفن بوا ..... کہو ، اچھی تو رہیں ؟ ‘‘ پولیس والے بڑے ہشیار ہوتے ہیں ۔

’’ آپ کی دعا ہے سرکار ۔ ‘‘

’’ بیگم کھانا تیار ہے ؟ ‘‘ انہوں نے نرمی سے خلیفن کو ٹالنا چاہا ۔ مہذب زبان میں اس کا مطلب ہے ، آپ تشریف لے جائیے ۔ کیونکہ کھاتے وقت صرف رذالے روٹی کے ٹکڑے کی آس میں ٹھہر جاتے ہیں ۔ مگر خلیفن کو کون ٹال سکتا تھا ۔

’’ اے قربان جاؤں سرکار کے ، کیا دادا جان کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہیں ۔ واجد میاں آنکھیں تو سرکار بالکل آپ جیسی نرگسی ہیں ۔ ‘‘

’’ بیگم ، یہ کیا بکواس ہے ...... ‘‘ باسط میاں کے ہاتھ کی لرزش

چھپائے نہ چھپی۔

"مجھ سے پوچھئے سرکار...... یہ تو آپ کی بہو... ممد میاں کی لونڈیا...... واحد میاں...."

"خاموش...... بدتمیز...... کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"سرکار..... سارا محلہ گواہ ہے۔ آپ کے ڈر سے کوئی بولتا ہی نہیں۔"

"محلہ گواہ ہے؟...... سچی بات ہوتی تو سب ہی کہتے۔ کیا میں نے ان کا منہ بند کیا ہے؟"

"سرکار، آپ سے کوئی بھید نہیں چھپا.... یہ واحد میاں کا ہے.... صورت دیکھئے یہ پٹھانی آنکھیں کہاں چھپیں گی، ابھی سے پولیس والوں کی طرح کا ہے...... صورت دیکھئے بچے کو باہنوں میں جھلا کر کہا "سرکار رحم کیجئے اس ننھی سی بچی پر سوچیئے میاں، اس کا کیا ہوگا...... اسے کون قبولے گا...... ممد میاں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا....."

"اول تم بکتی ہو، واحد میاں ایسے گئے گزرے بھی نہیں کہ موریوں میں ناک ڈالتے پھریں۔ دوسرے وہ ابھی پڑھ رہے ہیں اور پھر ان کی عمر ہی کیا ہے۔"

"پڑھنے کو کون روکتا ہے میاں۔ جم جم پڑھیں اور میاں بچہ پیدا کروانے کے لائق ہیں کہنے کو ابھی جھنڈولے ہی ہیں۔"

"بکواس مت کر......" سولہ سترہ برس کے واحد خاں اور پوردشنداں

سے آنسو بھری آنکھوں سے یہ ڈرامہ دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

"میاں ذرا سوچئے۔ آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ اسکی عزت رہ جائے گی۔ آپ کے عروج کو دعائیں دے گی۔ ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ دو روٹیاں تو آپ کے کتنے بھی کھا لیتے ہیں" انہوں نے لرزتی ہوئی بنو کا گھونگھٹ سرکا دیا۔" اس کی صورت دیکھئے سرکار!"

"ہم اپنی بہن کو زبان دے چکے ہیں خلیفن" سوکھی ماری بنو کی طرف آنکھ اٹھانے کی ان کی ہمت نہ ہوئی۔

"تو سرکار، شرع میں تو چار کی اجازت ہے..... واحد میاں شوق سے پھوپھی کی بیٹی بیاہ لائیں۔"

مگر اب باسط خاں کا پارہ چڑھنے لگا۔ پرانی تھانے داری کی رگ ابھر آئی۔ انہوں نے نوکروں سے کہا" دھکے دے کر نکال دو سالی کو۔"

بس گالی کا سننا تھا کہ خلیفن جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑیں۔

"تیری ایسی کی تیسی حرام خور، دغاباز۔" اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، گریبان پکڑ کر چپٹی جوتی اتار تڑ تڑ چار پانچ رکھ ہی دیں۔ باسط خاں نے جھنجھلائے ہوئے ریچھ کی طرح انہیں جھٹکا۔ مگر انہوں نے باؤلی کتیا کی طرح دانت گڑو دیئے۔ کرتا جھیر جھیر کر ڈالا۔ مونچھیں کھسوٹ ڈالیں۔ ایسی مردمار تو کبھی نہ تھیں۔ پر آج ان پر جانو مرگھٹ کی بھتنی سوار ہو گئی تھی۔

ہونا کیا تھا۔ دھکے دے کر حویلی سے نکال دی گئیں بچے کی پوٹلی بلے وہ
بلبے بلبے ہاتھ چلا کر باسط خان اور ساری پولیس فورس کو مغلظات سنا رہی تھیں۔
" اے محلہ والو! ڈوب مرو..... ارے یہ سپوڈنٹ ہے کہ شیطان...
..... اس کا لونڈا پرائی بہیوں کی عزت مٹی میں ملائے..... انھیں پیٹ رکھوئے
..... اور تم ہیجڑوں کی اولاد کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے..... ارے
ایک دن تم سب کی جوروئیں، بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں بھگائے گا۔"
انھوں نے کھڑکیوں، دروازوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگوں سے کہا۔
" ہے، ہے۔ چوڑیاں پہن کر گھروں میں گھس جاؤ۔ بیوی کے ہنگے
نلے۔" انھوں نے لالہ جی کو دروازے کی آڑ سے چوہے کی طرح جھانکتے دیکھ
کر پکارا۔ بے چارے نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔
ممد میاں گھر میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔ خلیفن نے انھیں کہیں کا نہ
رکھا۔ محلے میں سر اٹھا کر چلنا دوبھر ہو جائے گا۔ ہنکارتی ہوئی جب وہ
بچے اور بہو کو لے کر پہنچیں، تو ان کے پیچھے لونڈوں کی ڈھیری لگی ہوئی
تھی۔ بچے انھیں ایسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ پورس کی طرح سکندر اعظم
کے دربار میں منہ توڑ جواب دے کر آئی ہوں۔" ارے خلیفن بوا کی
ہمت تو دیکھو۔ سپوڈنٹ صاحب کی مونچھیں اکھاڑ ڈالیں"۔ مگر ممد میاں
کا جی چاہ رہا تھا کہ خلیفن کو چاب کر تھوک دیں موری میں۔ مگر اس سے
پہلے کہ ممد میاں ان پر حملہ کرتے، وہ بپھری شیرنی کی طرح انھیں پر برس
پڑیں۔ برقعہ اتار کر انھوں نے ان کے منہ پر دے مارا " لو...... یہ

برقع پہن کر نکلنا آج سے۔"

"بس خلیفن" بہت ہولیا۔ لے اب سیدھی طرح اپنے گھر کا راستہ ناپو۔ میری زندگی میں ویسے کون سی بہاریں تھیں جو اور تم نے کانٹے بو دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ ہے خالہ جی کا داماد نہیں۔ کوئی اڑنگا لگا کر چکی پسوا دے گا۔ اور میری ٹال میں آگ لگا دے گا سو الگ۔ نہ جانے کون منحوس گھڑی تھی جو تم سے پالا پڑا...... اس سے تو یہ بے حیا رنڈی مر گئی ہوتی؟"

انہوں نے بنّو کو ایسا ریٹ لگایا کہ وہ جا کے گری اوندھے منہ۔

"خبردار جو تم لے لونڈیا پہ ہاتھ اٹھایا۔ مارنا ہے تو مجھے مارو بنو کے باپ..... قصور میرا ہے...... آگ لگے میری زبان کو..... میں نے تو لونڈیا کے بھلے کو یہ مفضیحتا مول لیا۔" انھوں نے بچہ بنو کی گود میں دے دیا۔ اور پٹی پٹائی شکل لئے چل پڑیں اپنے اجاڑ گھر کی طرف۔

سارا دن خلیفن روزے میں تھکی ہاری کھری چارپائی پر پڑی دھاروں دھار رویا کیں۔ انھیں افطار کی بھی فکر نہ تھی۔ وہ سچ مچ جلتا توا تھیں۔ بس کی گانٹھ جس چیز میں ہاتھ ڈال دیں۔ اس کا کباڑا ہو جائے سچ تو ہے جو ہونا تھا ہو چکا۔ چپ چاپ کہیں بنو کو کوئی بڈھا ٹھڈا دولھا جو مل ہی جاتا۔ مگر اب جو یہ تھڑی پٹ گئی تو کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔ پھر پولیس والے ہوتے ہیں ذرا بسیلے، بچھوا، باسط خان کے ڈنک سے بچنا مشکل ہے آج خلیفن کو اپنے نکمے پن کا یقین ہو گیا۔ اسی زبان کی خاطر ہو داماد سے نہ بنی۔

عصر کی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھیں کہ آہستہ سے کنڈی کھڑکی۔
" یا علی ... یا پیر دستگیر ..... اے مولا، بارہ اماموں کا صدقہ، پولیس چوکی کا آدمی نہ ہو۔ اے خدا رحم ..... " کانپتے لرزتے ہاتھوں سے کنڈی کھولی تو کوئی نظر نہ آیا۔ اطمینان کا سانس لیا۔ اور بند ہی کرنے والی تھیں کہ واحد میاں بھیگی بلی بنے دیوار کے پاس سکڑے نظر آئے ... !"

" الٰہی خیر " بوا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

" کیا کام لڑکے ؟ " رکھائی سے بولیں۔

واحد میاں نے کٹی ہوئی گائے کی طرح ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔

" اندر آجاؤ بیٹیا۔ " بوا ایک دم نرم پڑ گئیں۔

واحد خاں پلنگ کی پٹی پر سر جھکائے بیٹھ گئے۔ آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھ کر بولنا چاہا۔ مگر گلے میں آواز گھٹ گئی۔ ادھر آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو نکل پڑے۔

" مرد ہو کر روتے ہو۔ اس بدبخت کا تو خیال کرو۔ ذرا سی بچی پر کیا بیت گئی۔ میرا تو کلیجہ شق ہوا جائے ہے۔ کچی عمر کی جاپے میں اس ننھی سی کلی پر کیا گذری ہوگی۔ بڑے ہو جاؤ گے تب پتہ چلے گا۔ میاں تمہارا کیا بگڑا، ماشا اللہ بی۔ آ، ایما پاس کرو گے۔ لندھن جاؤ گے۔ دولھا بنے گھوڑی پر چڑھ کر نواب زادی بیاہ لاؤ گے۔"

" نہیں بوا ... میں سنکھیا کھا لوں گا۔ " واحد میاں کی ہچکی بندھ گئی۔

"تُف ہے تمہاری اوقات پر..... تم مزے سے قبر میں جا لیٹو گے اور وہ تمہارا گناہ چھاتی سے لگائے گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ کیا بھول سا ہے واجد..... باپ کی شکل ہے ماشاءاللہ۔" واحد کے کان سرخ ہو گئے۔ کمسن باپ جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں... نامعلوم سے غرور سے مسکرا پڑا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ہونٹ پھر کانپنے لگے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا.... بوا کو تو فرصت نہ تھی۔ اپنے ہی آنسوؤں سے۔ محلے میں افراتفری پڑ گئی۔ سنا مائی ہفان میں مسجد کے سامنے پولیس کی چوکی لگ گئی۔ محلے کے شہدوں نے سپرنٹنڈنٹ کا مکان جلانے کی کوشش کی۔ مسجد میں بعد نماز مغرب بڑی ہڑلونگ مچی ملاجی تو فتوےٰ دیتے تھے کہ دونوں کو سنگسار کر دینا چاہیئے۔ شرع شریف کا یہی حکم ہے۔ پر محلے کے نوجوانوں نے ہلڑ مچا دیا۔ ان چھوکروں کو تو بس دنگے فساد کے لئے کوئی بہانہ چاہیئے۔ ذرا سی بات پر لال جھنڈیاں لے کر طوفان مچانے لگتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں باسط خان کا پتلا بنا کر چوراہے پر جلا دیا گیا۔ کسی سر پھرے نے رائے دی۔ کیوں نہ حویلی ہی کو پھونک دیا جائے۔ بات بڑھی۔ پولیس آگئی۔ لاٹھی چارج ہوتے ہوتے بچا۔ بات اوپر تک پہنچ گئی۔ دو چار اخباروں نے بھی اس لطیفے سے فائدہ اٹھایا۔ نہایت سنگین قسم کے کارٹون نکل گئے۔ پیر کو افطار سے پہلے ہی سپرنٹنڈنٹ صاحب ممدخان کے دروازے پر کنڈی کھٹکھٹانے پہنچ گئے۔

" خلیفن جانیں ، میں کچھ نہیں جانتا . . . . " ممد خاں نے صاف کہہ دیا اور روزے میں بوکھلائی بدقسمتی کا پرچم اڑاتی . بیگم بھی اتنے میں پہنچ گئی تھیں ۔

" ممد بھائی جو ہونا تھا ہو گیا ۔ قاضی صاحب تشریف لا رہے ہیں نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیئے " بیگم کھمبے کی آڑ میں کہہ رہی تھی ۔

" میں نے کہہ دیا کہ خلیفن جانیں . . . . . میں کون ہوتا ہوں بیچ میں بولنے والا ۔"

خلیفن نے جانتے ہی مورچہ سنبھال لیا ۔ جھٹ سے چارپائی پر دری اور چادر بچھائی ، ایک ٹین کی کرسی باسط خاں کی طرف بڑھائی ۔

" ہاں صاحب ، دیر کی کیا ضرورت ہے ۔ گھڑی میں قاضی صاحب آتے ہوں گے "

" ارے نیک بخت ، کچھ شربت وربت کا تو انتظام کرو " انھوں نے ممد میاں کو ڈانٹا ۔ نکاح کے بعد سب محلے کے معززین نے مل کر روزہ افطار کیا ۔ محلے کے وہی لفنگے جو گھڑی بھر پہلے باسط خاں کی ارتھی جلا رہے تھے ، باسط خاں زندہ باد کے نعرے لگانے لگے ۔ باسط خاں کو صرف ایک شکایت تھی کہ پوتے کا نام خلیفن نے بد ذاتی میں واجد خاں ، ان کے اپنے باپ کے نام پر رکھا ۔ حالانکہ واحد میاں کے بیٹے کا نام ساجد عرصہ ہوا طے پا چکا تھا ۔ خیر اب انشاءاللہ عقیقہ پر ساجد

ہی نام رکھا جائے گا۔

خلیفن دانت نکوسے لپ جھپ سب کی خاطریں کر رہی تھیں۔ دوڑ دوڑ کر سب کو شربت کے گلاس بانٹ رہی تھیں۔ گلی میں بدمعاش لونڈے شربت کی کٹوریاں پی پی کر نعرے لگا رہے تھے۔ "خلیفن زندہ باد"

"اے چپ رہو حرام خورو!" خلیفن شرما شرما کر انہیں کھجوریں اور نان خطائیاں بانٹ رہی تھیں۔

پھر ایک معرکہ اور ممدمیاں نے خلیفن کی چوکھٹ پر سر کیا۔ جا کر انہوں نے کنڈی کھٹکھٹائی اور بالکل جیسے کوئی پڑوسن سے نون مانگے خلیفن کی خدمت میں نکاح کا پیغام پیش کر دیا۔ پہلے تو منہ پھاڑے خلیفن بھونچکی سی رہ گئیں۔ پھر جو بھری ہیں تو خدا کی پناہ!

"حرامزادے، کلموہے، چمرکٹے۔ چیرٹ قناتی ..... اے تجھے ڈھائی گھڑی کی آئے ..... تجھے طاعون سمیٹے۔ تیری میت اٹھے ....." پھر جو جوتی لے کر پلی ہیں ممدمیاں پہ تو پلیتن نکال دیا۔ مگر ممدمیاں درِ محبوب پر گردن کٹانے کا تہیہ کر کے آئے تھے، جوتیوں اور گالیوں کی بھوار کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ اندر آ گئے۔ وہ جوتیاں برسا رہی تھی۔ ممدمیاں کہنیوں سے وار رد کرتے جا رہے ہیں اور اظہارِ عشق بھی

کرتے جا رہے ہیں

"اری سن تو نیک بخت ...... اری .... خلیفن .... تجھے .... میری قسم ...... میری بات تو سن .. رات کو .... نیند نہیں آتی .."

"اے تو جا، قبر میں موئے ...... تجھے ہیضہ لے جائے"۔

"نکاح کر رہا ہوں، ..... کوئی بری نظر نہیں ڈالی"۔

"اے ہے۔ اٹھائی گیرے ..... ڈھونگی ...... تو بری نظر ڈالے گا .... تیرے دیدے نہ پھوڑ دوں گی .... میری محبت کا تو نے یہ پھل دیا ہے ..... کمینے .... نکل .... نکل میرے گھر سے"۔

"بس جی بس ...... بڑھتی ہی چلی جاتی ہو۔" ممد میاں نے ہاتھ مروڑ کر جوتی چھین کر الگ پھینکی۔

"اس میں میرا کیا قصور؟"

"قصور؟ ...... قصور تو میرا ہے .... بدمعاش کہ تیرے لئے محلے بھر سے جھگڑا کیا۔ تیرے بچوں کو اپنا سمجھا۔" خلیفن کا گلا بھر آیا۔

"تو جب اپنا سمجھا ہے تو چل کے سنبھالو کمبختوں کو ......" ممدّ میاں گھگھیائے۔

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ ..... میں تیرے بچوں کی لونڈی ہوں موئے .... چل دور ہو ..." وہ دور ہٹیں۔

"لونڈی ہو کہ بیگم .... اب تو تم ہی سب کچھ ہو ...." ممد میاں ان کی طرف کھسکے۔

"ارے جا، جا...... گھاس کھا گیا ہے...... خبردار جو تو نے ایک قدم بڑھایا......" وہ پیچھے ہٹیں۔ مگر ممد میاں بڑھتے ہی چلے گئے۔

"موئے جانتا ہے کہ نہیں......" خلیقن سہم کر دیوار سے چپک گئیں۔

"نہیں خلیقن!...... جی کرے تو مار ڈال...... پر اللہ قسم...... اب صبر نہیں ہوتا۔" ٹھنڈی آہ بھر کے ممد میاں بالکل ہی سٹ گئے۔

"ہے ہے موئے...... بے شرم......" خلیقن کی آواز گھٹ گئی۔

"دل پہ قابو نہیں خلیقن...... قرآن قسم......" اور ممد میاں نے لالٹین کی بتی تیل میں اتار کر بجھا دی۔

رات کے دو بجے مسجد سے نکاح کر کے نکلے اور ممد میاں خلیقن کو اکے پر بٹھا کر لے چلے تو ان کے دانت مونچھوں میں بکھرے جا رہے تھے۔ جیسے وہ نئی دلہن بیاہ کر لے جا رہے ہوں۔ خلیقن بھی کنواری لونڈیا کی طرح کانپ رہی تھیں۔

"سچ بتاؤں خلیقن...... جب پہلے دن بنو کی زچگی میں تم نے مجھے گالیاں دی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا...... پر تم بھی تو مجھے چاہنے لگی تھیں۔"

"ائے ہے توبہ! خدا نہ کرے۔" خلیفن بھنائیں۔

"آب تم ہم سے جھوٹ نہ بولو۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ بھلا تمہاری نیت صاف ہوتی تو میرے دل میں میل کیوں آتا؟" ممدمیاں نے جرح کی۔ خلیفن بوکھلا گئیں۔

"تجھ پر خدا کی سنوار....." انھوں نے حلق میں موٹی سی گالی دبا کر کہا۔ اگر قسمت نے ممدمیاں کو ان کا خدائے مجازی نہ بنا دیا ہوتا تو وہ ان کی سات پشتوں کو مزے سے پنتیں۔

"میں تو بچوں کی وجہ سے....." وہ چپ ہو گئیں۔

"بچوں کی اتنی فکر ہے ظالم! اور بچوں کا باپ آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔" ممدمیاں نے کہنی سے خلیفن کا گھٹنا دبا کر کہا۔

"دنیا کیا کہے گی؟"

"ارے گولی مارو سالی دنیا کو۔" ممدمیاں نے چابک پھٹکارا۔ اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

"سُڈلے سے بہت دِن سے تعلق تھا۔" وہاب چچا کی دولہن نے گیئر بدل کر لونڈے کو ایک گھٹنے سے دوسرے پر گھسکا۔

"اے ہوگا۔ ہماری بلا سے۔" بیوی نے اکتا کر پان کی کتر توڑی۔ اور کتھا چونا لگانے لگیں۔

دور گلی میں کوئی آوارہ چھوکرا گاتا پنجہ شاہی کی طرف جا رہا تھا۔

"عشق پہ زور نہیں۔"

اور خلیفن ڈھیر سارے جھوٹے برتن سامنے رکھے جھاجھم مانجھ رہی تھی۔ دو سیر آٹا مٹھو کٹنے سے مونڈھوں میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ محمد میاں حقہ پیتے میں موچھوں ہی موچھوں میں مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں گستاخ شرارت تھی۔

رات کو جب محمد میاں اپنا بھاری سیاہ ہاتھ ان کے دل پر رکھ کر غافل سو رہے تھے تو خلیفن جاگ رہی تھی۔ جازم کے پیچھے سوئے ہوئے بچوں کی میٹھی سانسیں ان کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ انھیں ایسا معلوم ہوا۔ وہ بڑے چھتنار درخت کے شربتی سائے میں لیٹی ہیں۔ اور ان کی گود میں میٹھے میٹھے پھل برس رہے ہیں۔

ختم شد